کاغز کی دیوار

محافظ حیدر

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

کاغذ کی دیوار

(افسانے)

محافظ حیدر

تخلیق کار پبلیشرز
۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : کاغذ کی دیوار
مصنف : محافظ حیدر
پتہ : 3 A، فریرا مینشن، ستیلا دیوی ٹمپل روڈ، ماہم، بمبئی ۴۰۰۰۱۶
بار اوّل : ۱۹۹۳ء
قیمت : پچاس روپے Price: 50/-
ناشر : انیس امروہوی
تخلیق کار پبلیشرز، ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
سرورق : انیس امروہوی
کتابت : ایم۔ حمران اعظمی
مطبع : بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، ۲۵۰۹۔ کوچہ بقاء اللہ، تراہا بہرام خاں، دہلی ۲

ملنے کے پتے :

- ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، دریا گنج، دہلی ۶
- موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲
- اہلووالیہ بک ڈپو، ۹۹۸۸/۴۹۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵
- نور پبلیشنگ ہاؤس، فراش خانہ، دہلی ۶

اس کتاب کی اشاعت میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

T.P. : 017
MOHAFIZ HAIDER
KAGHAZ KI DEEWAR (STORIES)
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
1779, KUCHAH DAKHNI RAI, DARYA GANJ,
NEW DELHI-110002
1993 Rs. 50.00

قرۃ العین حیدر

کے نام

●●

یاد رکھو کہ
علم کے ساتھ عمل ضروری ہے
نہ عمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ علم کے بغیر
عمل نفع بخش ہے
جس علم کی پُشت پر عمل موجود نہ ہو
وہ علم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رح
——— کشف المحجوب سے

فہرست

۱	سائے جو بچھڑ گئے	۷
۲	ڈوبتے اُبھرتے تنکے	۲۲
۳	ایک سالگرہ	۳۰
۴	رُوح کا جُگنو	۵۰
۵	کاغذ کی دیوار	۵۳
۶	کیلی ڈسکوپ	۵۷
۷	روزنامچے کا ایک ورق	۶۱
۸	پاسپورٹ کی شناخت	۶۵
۹	ال م اور اوم	۷۰
۱۰	کنفیشن	۷۶
۱۱	بھگوان سمپورنانند	۸۵
۱۲	ہوائی قلعہ	۱۰۱
۱۳	نہ جانے کیوں	۱۰۶

سائے جو بچھڑ گئے

نواب صاحب مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور عملِ تنفّس تیز تھا۔ ان کی خواب گاہ سے ذرا فاصلے پر چاروں طرف سے بند ڈرائنگ روم میں ککو کلاک نے اپنی میکانکی طبیعت سے قطع نظر اپنی مثالی وقت کی پابندی کا دعویٰ کر دیا جو وہ ہر پندرہ منٹ سے کرتی رہتی تھی اور ہر دوسری آواز تک صرف ٹِک ٹِک ٹِک کرتی رہتی تھی۔ گویا اپنے دعوے کا جواب نہ پا کر وہ بہت ہی مسرور ہے۔ نواب صاحب کو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ہے اس ککو کلاک کو اسی طرح دیکھتے اور سنتے رہے ہیں۔ یہ ککو کلاک جب اس گھر میں نئی نئی آئی تھی، انھیں پیدا ہوئے چند ہی روز گذرے تھے اور اس لئے آئی تھی کہ ان کی ماں رات کو ان کے لئے کئی دفعہ اٹھتی تھیں۔ انھیں گھڑی دیکھے بغیر ہی وقت معلوم ہو سکے۔ گو اس کی حیثیت ان کے خاندان کے ایک رکن کی سی تھی مگر ان کے خاندان کے ہر رکن کا ردِّ عمل اس کی ہر قسم کی آواز پر میکانکی ہی تھا۔ کسی نے اس کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ ہی نہیں کی۔ لیکن اس وقت جبکہ نواب صاحب اور ان کی نیند کے درمیان ان کے طوفانی خیالات کی وسیع و عریض خلیج حائل ہو چکی تھی، اس کی ہر پندرھویں منٹ کی پکار ان کو چند لمحوں کے لئے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

سناٹے کے بیکراں سمندر میں تھوڑی سی سرگم گھل جانے سے ماحول کے جمود میں نغمگی کی لرزش کی رَو سی گذر جاتی اور وقت کی لازوال رفتار کا نواب صاحب کو شدید احساس ہونے لگتا۔

"پونے تین ہو گئے اور زلیخا نہیں آئی۔"

زندگی کی سیدھی سادی روش تو رہی ایک طرف، شاید ہی کسی موڑ پر انھیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو کہ وقت کیسے گذرتا ہے۔ لیکن آج کی رات یوں محسوس ہوتا تھا گویا دُنیا بھر میں وہ اکیلے کھڑے ہیں اور وقت کا جلوس ایک قدم اور ایک رفتار سے گذرتا ہوا انھیں سلامی دے رہا ہے۔ یہ ثانیے گذر رہے ہیں، یہ لمحوں کی قطار ہے، یہ منٹوں کے دستے ہیں اور یہ...

پھر ایک بار ککو کلاک کا پُرانا راگ گونج اٹھا۔

اور پھر وہی ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک.....

"تین بج گئے اور زلیخا نہیں"

رہ رہ کر نواب صاحب کو یہ خیال آتا تھا کہ کہیں زلیخا بھاگ نہ گئی ہو۔ اس لئے صبح کا بڑی بے تابی سے انھیں انتظار تھا، لیکن آج تو جیسے کائنات کی لامحدود وسعتوں میں ہر چیز گم ہو گئی تھی۔ زلیخا بھی، نیند بھی، سحر بھی۔

حیرت تو دواؤں کے استعمال کے باوجود نیند نہ آنے پر تھی۔ حکیم صاحب کے دیئے ہوئے خمیرہ مروارید اور جواہر مہرے کی گولیوں کے پابندی کے استعمال سے ان کے دل کی حالت پہلے سے کہیں بہتر تھی اور رات کو بڑی اچھی نیند آجاتی تھی۔ خصوصاً جواہر مہرے کی گولیوں سے بڑا فائدہ تھا جن کے خمیر میں ہیرے، یاقوت، نیلم، زمرد اور اصلی موتی تھے۔ نواب صاحب کی اب اتنی استطاعت تو تھی نہیں کہ یہ جواہر مہرہ بنوا سکتے یا خرید سکتے مگر حکیم صاحب سے قدیم دوستی کی بنا پر ان کو یہ گولیاں مفت مل جاتی تھیں۔ قدیم دوستی کے علاوہ جو ایک ہی استاد سے گلستاں، بوستاں پڑھنے اور ایک مسجد میں پابندی سے نماز اور تراویح پڑھنے کی وجہ سے تھی حکیم صاحب کو یہ بات بہت پسند تھی کہ نواب صاحب ڈاکٹری علاج میں اعتقاد بالکل نہ رکھتے تھے اور جس طرح نواب صاحب کے والدِ مرحوم ان کے والد مرحوم سے علاج کرواتے تھے، اسی طرح یہ بھی ہمیشہ ان ہی سے کرواتے تھے۔ اس علاج معالجے کی نوعیت خاندانی ہو گئی تھی۔ نواب صاحب کے والد کے زمانے میں ان کے والد نے اور نواب صاحب کی خوشحالی کے زمانے میں انھوں نے جو مانگا ملا۔ اب حکیم صاحب شرافت کا تقاضا یہی سمجھتے تھے کہ نواب صاحب کی مالی حالت خستہ ہو گئی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ان کا دل بہت اچھا ہے، اسی لئے وہ ان کے دل کا مفت ہی علاج کریں گے۔ ویسے

اتنا قیمتی جواہر مہرہ دینے پر بھی حکیم صاحب کو گھاٹا اس لئے نہیں تھا کہ جس رئیس نے اپنے دل کے علاج کے لئے انھیں یہ جواہرات اور پیشگی معاوضہ مہیا کر دیا تھا وہ یا تو ان کی تیاری کا انتظار نہ کر سکا یا اتنے مصارف کا بار اس کا دل برداشت نہ کر سکا۔ اسے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ اپنے وصیت نامے میں ان گولیوں کے بارے میں کوئی صراحت کر جاتا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے انھیں ایک انمول خزانے کی طرح محفوظ کر لینے کی ٹھان لی اور بیٹھے سربمہر ڈبوں میں بند کر ہی رہے تھے کہ نواب صاحب کا پرانا وفادار ملازم رمضانی آ پہنچا اور اطلاع دی کہ نواب صاحب کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور آپ کو بلاتے ہیں۔

نواب صاحب کا یہ بلاوا کسی اور حکیم کے لئے موت کے بلاوے سے کم نہ تھا۔ مگر حکیم صاحب اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر فوراً پہنچ گئے۔ معائنہ کیا، تشخیص سے اطمینان کر لیا اور ایک طشتری میں دودھ منگوا کر جواہر مہرے کی ایک گولی اسی وقت گھس کر اور تحلیل کر کے پلا دی۔ فوراً فائدہ ہوا۔ بڑی دریا دلی سے انھوں نے اور بہت سی گولیاں ان کے حوالے کر دیں۔ حکیم صاحب نواب صاحب کے گھر کی ہر بات اور حالت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے انھوں نے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ دل پر کسی بات کا صدمہ نہ لیجئے، یہی سب سے بڑا پرہیز اور علاج ہے۔ نواب صاحب بے چارے اس پرہیز کی کوشش تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن ....

"سوا تین بج گئے اور زلیخا نہیں آئی"

زلیخا آج پہلی دفعہ رات کو گھر سے غائب ہو گئی۔ یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ نیمرہ مروارید اور جواہر مہرے کے بے پناہ طاقتور اور طاقت بخش عناصر بھی نواب صاحب کے متحرک دماغ اور منتشر اعصاب کے آگے بے بس تھے۔ آج نواب صاحب کو نیند نہیں آئے گی اور یہ صدمہ ایسا ہے کہ شاید ہی پھر کبھی انھیں نیند آئے۔

نواب صاحب نے نگاہوں کو ذرا سی حرکت دی تو دیکھا کہ برابر کی مسہری پر بیگم صاحبہ اسی طرح بے خبر سو رہی ہیں جیسے دولھن بننے کے بعد سویا کرتی تھیں۔ اس وقت بھرپور جوانی اور بیکاری کی وجہ سے یوں سوتی تھیں اور اب اتنا بڑا گھر اور اتنے بڑے خاندان کی دن بھر کی دیکھ بھال کے بوجھ سے تھک کر سوتی ہیں نواب صاحب کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب بیگم صاحبہ کو اولاد کی

بڑی فکر تھی۔ یا تو اولاد ہی نہیں ہوتی تھی اور جب ہوئی تو ہوتے ہی لگی۔ پیٹ بھر کے ہوئی، مگر اب اولاد کی انھیں کوئی فکر ہی نہیں۔ چاہے لڑکی رات بھر گھر سے غائب رہے مگر وہ تو یوں ہی سوئیں گی جو کرنا ہو کر لو۔

نواب صاحب کو اصل افسوس اور رنج اس بات کا نہیں تھا کہ بیگم صاحبہ اولاد کی فکر نہیں کرتیں بلکہ اس بات کا تھا کہ وہ اولاد کی فکر کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ نواب صاحب اپنی نمازوں اور وظائف سے فارغ ہو کر کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب ڈائیننگ ٹیبل پر پہنچے تو زلیخا کو نہیں پایا۔ پوچھا زلیخا کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا پکچر دیکھنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ تم شروع کرو۔ پکچر کے نام پر نواب صاحب بھنا گئے۔ مگر حکیم صاحب کے مشورے کے مطابق کہ دل پر کسی بات کا اثر نہ لیجئے، گول ہو گئے۔ غصے کا بڑا سا نوالہ چبا کر بولے زلیخا آجائے تو سب ساتھ ہی کھالیں گے۔ بیگم صاحبہ نے فوراً جواب دیا کہ پکچر دیکھنے پر تم اسے پھر ڈانٹو گے اور پھر بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ تم اپنی جان کو دیکھو۔ یہ کہہ کر انھوں نے کھانا کھلوا دیا۔ بس اس وقت سے نواب صاحب کلو کلاک کا ہر گھنٹہ گن رہے تھے۔

"ساڑھے تین ہو گئے اور زلیخا نہیں آئی۔"

نواب صاحب کو بیگم صاحبہ کی اس منطق پر بھی بڑا غصہ تھا کہ اولاد چاہے کچھ کرے مگر اپنے دل کی بیماری کے پیشِ نظر یہ چپ ہو جائیں۔ ان کے دل کی بیماری کا بہانہ اولاد کی تائید میں ہو جانے کی بجائے ان کی تائید میں ہونا چاہیئے۔ بیگم صاحبہ کو چاہیئے کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو سختی سے تاکید کر دیں کہ وہ اپنے باپ کے دل کی حالت کا خیال کر کے ایسے کام نہ کریں جن سے باپ کو صدمہ پہنچے اور خدانخواستہ کچھ ہو جائے۔ مگر وہ الٹا ان ہی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی جان کو دیکھیں۔ اب وہ بیگم صاحبہ سے کیسے کہیں کہ جان سے زیادہ آن انھیں عزیز ہے۔ یہ بات کہنے کی بھی تو نہیں۔ بیگم صاحبہ کو خود سمجھنا چاہیئے۔ مگر بیگم صاحبہ کی عقل کو تو جیسے مامتا کی دیمک چاٹ گئی۔ انھیں اپنی اولاد میں نہ کوئی عیب دکھائی دیتا ہے نہ اصلاح کا کوئی خیال ہے۔ جو کچھ ہے ٹھیک ہے، جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ غضب خدا کا کہ بیٹی گھر سے غائب ہے اور ماں اسی طرح خاموش سو رہی ہے۔ نواب صاحب یہ تو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں کہ ماں نے ہی اپنی بیٹی کو کسی

غیر مرد کے پہلو میں سونے کے لئے بھیج دیا ہو اور نہ ہی یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ گھبرانے کی بات نہیں وہ شاید اپنی کسی خالہ، چچی، پھوپھی یا ممانی کے ہاں سو گئی ہو۔ اس صورت میں ان کو اطلاع ضرور مل جاتی۔ اب اگر وہ خاندان میں ہر جگہ ٹیلیفون کر کے یا اپنے کسی لڑکے کو بھیج کر دریافت کروائیں اور وہاں زلیخا نہ ہو تو سب شبہ کرنے لگیں گے، بات پھیل جائے گی اور ناک کٹ جائے گی۔ سارے شہر میں چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں ہونے لگیں گی اور ان کے خاندان کی کسی لڑکی کے لئے کوئی لڑکا ہی نہیں ملے گا۔

نواب صاحب کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ چھوٹے سے تھے، چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے اپنے اسکول کے ساتھیوں اور استادوں کے ساتھ شہر سے بیس بائیس میل دور تعلیمی تفریح کے لئے گئے تھے۔ شام کو واپس ہونے لگے تو بس بگڑ گئی۔ تمام کوششوں کے بعد ڈرائیور نے تھک ہار کر جواب دے دیا کہ کلچ پلیٹ بگڑ گئی ہے وہ کل شہر جا کر لانے ہی پر ٹھیک ہو گی اور بس چلے گی۔ سب کو وہیں ڈاک بنگلے میں جیسے تیسے ٹھہر جانا پڑا۔ دوسرے دن گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ ماں باپ اور سبھی گھر والوں نے رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ خاندان بھر دوڑا پھر رہا تھا۔ کہیں فال نکلوائی جا رہی تھی۔ ان کی ماں اس بات پر اتنی بگڑ گئی تھیں کہ اسی روز انھوں نے ان کو اسکول سے نکلوا لیا اور پھر کسی اسکول کا منہ انھیں دیکھنے نہ دیا۔ ان کو اپنی ماں کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں کہ آگ لگے ایسے اسکول کو اور جہنم میں جائے ایسی پڑھائی۔ پڑھا لکھا کر منجھلے نواب سے ہمیں نوکری نہیں کروانی ہے۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔ میرا لال بس گھر میں اللہ رسول کی باتیں پڑھے گا۔ اور اپنی عاقبت سنوارے گا اس کی دنیا سنوارنے والے اس کے سر پر سلامت رہیں۔

نواب صاحب نے سوچا کہ ایک وہ ماں تھی جس کا گیارہ بارہ سال کا لڑکا اپنے کتنے ہی ساتھیوں اور استادوں کے ساتھ حیرت سے تھا پھر بھی اتنی بے چین ہو گئی تھی اور ایک یہ ماں ہے جس کی اٹھارہ سال کی بیٹی بغیر کسی اطلاع کے لاپتہ ہے اور یہ اتنے آرام سے سو رہی ہے۔

"پونے چار بج گئے اور زلیخا نہیں آئی۔"

بیگم صاحبہ نواب صاحب کو مسہری پر لٹا گئیں اور جلدی سو جانے کی تاکید کر گئیں۔ گھر داری کے تمام فرائض سے مکمل طور پر فارغ ہو کر خود بھی مسہری پر پہنچیں اور پان کی تازہ گلوری حسبِ عادت منہ میں رکھی جو رات بھر وہیں پڑی رہتی۔ دن بھر کی مسلسل تھکن کے بعد لیٹنے سے آرام کی جو لذّت ملتی ہے، اس کی ابھی پہلی جھلک ہی تھی کہ نواب صاحب نے بڑے ہی دھیمے لیکن غصّے اور نفرت سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔ "زلیخا آگئی؟"

بیگم صاحبہ کا دل دھک سے ہو گیا اور منہ کا مزہ بدل گیا۔ "ہائے اللہ مر جائے نگوڑی زلیخا۔ تم اس کے پیچھے کیوں مرتے ہو۔ وہ کوئی ننھّی دودھ پیتی تو ہے نہیں کہ کوئی اٹھا لے جائے۔ اور نہ آوارہ بد چلن کہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے۔ پکچر کے بعد اپنی سہیلی کے ساتھ اس کے گھر چلی گی ہو گی۔ میں کہتی ہوں صاف صاف باتوں میں سے گندی گندی چیزیں ٹٹول کر تم کیوں نکالتے ہو۔ اپنی اولاد کی تربیت پر بھروسہ نہیں؟ سو جاؤ چپ چاپ۔ اب نہ کرنا زلیخا کی بات۔" یہ کہہ کے بیگم صاحبہ نے کروٹ بدل لی۔ اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ نواب صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے جیسے وہ کوئی بچّے تھے اور آدھی رات کو سوتے سے اٹھ کر اور ماں کو جگا کر بسکٹ مانگا تھا اور ماں نے ڈانٹ دیا۔

تربیت کی بات کر کے بیگم صاحبہ خود بھی چپ ہو گئیں اور نواب صاحب کو بھی چپ کر دیا۔ لیکن نواب صاحب کا دماغ بھلا کیا چپ رہتا، وہ تو ذرا ذرا سی بات پر چلّانے لگتا ہے۔ اور یہ تو بہت بڑی بات تھی۔

نواب صاحب نے سوچا، ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوئی تھی اپنے بڑے لڑکے مسلم کو انھوں نے اسی اسکول میں شریک کروایا تھا جہاں وہ خود بچپن میں پڑھتے تھے۔ دو تین سال تک وہ وہاں پڑھتا رہا لیکن اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اپنی بڑی بہن کے فرزند کو انگریز بچّوں کی طرح بات چیت کرتا دیکھ کر حرص میں مسلم کو بھی اس کے ساتھ کانونٹ اسکول میں شریک کروا دیا۔ یہ لاکھ سمجھاتے رہے کہ انگریزی بات چیت کے ساتھ مسلم انگریزی طور طریق بھی سیکھ جائے گا، مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ ان کی رٹ بس یہی تھی کہ ہم بڑے لوگ ہیں۔ ہمارا خاندان اونچا ہے۔ ہم دولت اور اقبال میں کسی سے کم نہیں۔ مسلم کل کو بڑا ہو جائے

اور سوسائٹی میں جائے تو خاندان کی آبرو رکھے۔ تمہاری طرح بس گھر، مسجد اور مشاعروں کا نہ ہو کر رہ جائے۔ میں تو اسے ولایت بھیجوں گی اور بہت بڑا آدمی بناؤں گی دیکھ لینا۔ نواب صاحب نے فیس بہت زیادہ ہونے کا بہانہ بھی بنایا مگر بات بنی نہیں۔ کیونکہ اتنا بڑا جاگیردار اور ایسی بات کہے تو اس کو بڑا منہ اور چھوٹی بات کہتے ہیں۔ کانونٹ اسکول میں مسلم کی محض شرکت ہی سے نواب صاحب کے جذبات بھڑک گئے تھے۔ نصابی کتابوں کی فہرست دیکھ کر تو جل ہی گئے۔ اب مسلم بائبل پڑھے یہ تو نہ ہوگا اور مسلم کی شرکت کو روکنے کا ایک اور اچھا بہانہ ان کے ہاتھ لگا۔ بیگم صاحبہ سے صاف صاف انھوں نے کہہ دیا کہ یہ بات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور وہ مسلم کو ہرگز نہ پڑھنے دیں گے۔ اس پر بیگم صاحبہ نے قرآنی آیات کا حوالہ دینا شروع کیا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ علم حاصل کرنے کا خود قرآنِ حکیم نے حکم دیا ہے۔ پھر بائبل تو حضرت عیسیٰ کی کتاب ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور جن کو ہم بھی پیغمبرِ برحق مانتے ہیں۔ اہلِ کتاب کی عورتوں سے بھی قرآن کی رُو سے شادی بیاہ جائز ہے اور پھر دوسرے مذاہب کا علم حاصل کرنے کے بعد ہی صحیح معنوں میں مسلم کو پتہ چلے گا کہ اسلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

نواب صاحب اس منزل پر ہمت ہار گئے اور بیگم صاحبہ کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ مسلم کے بعد خالد، عائشہ، مبارک، محمود، سبحان، زلیخا، رضیہ اور شوکت اپنے اپنے وقت پر سبھی کانونٹ اسکول میں شریک کر دیئے گئے۔ نواب صاحب کے خیال میں تعلیم کی بسم اللہ ہی غلط تھی۔ بلکہ خود ان کے الفاظ میں ان بچوں کی بسم اللہ ہی اے بی ڈیکیٹ سے ہوئی تھی۔ ان کونپلوں کی آبیاری میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹا کر نواب صاحب کی دُور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ آگے بڑھ کر کیا ہوں گے اور ان کے سائے کہاں تک پہنچیں گے۔ چنانچہ کسی کا رجحان مذہب کی طرف نہ ہوا۔ نواب صاحب نے لاکھ کوشش کی کچھ باتیں مذہب کی بھی ان کو معلوم ہوں مگر بچوں نے ان کی کچھ نہ چلنے دی اور بیگم صاحبہ بھی یہی کہتی رہیں کہ وہ کونسی مشکل باتیں ہیں جن کے سکھانے کی جلدی ہے۔ بچہ ایک دفعہ میں نماز سیکھ لیتا ہے اور ایک دو مہینے میں قرآن پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کئی استاد رکھے گئے مگر بچے ٹال جاتے۔ آئے دن نت نئے بہانے بناتے۔ کرکٹ کی گیند انگلی چھو کر نکل گئی۔ آپ آٹھ دن کے بعد آئیے۔ فٹ بال میں گول کے پول سے پاؤں لڑ گیا اور ٹخنہ اُتر گیا ایک مہینے کے بعد آئیے۔ چنانچہ استاد

مفت کی تنخواہ سے زیادہ دن خوش نہ رہنے پاتے کہ نکال دیئے جاتے۔ تنگ آکر نواب صاحب نے یہ فرض اپنے سر لے لیا بچے ان کو بھی چکمے دے جاتے۔ پہلے تو ان کو دقت نہیں دیتے۔ صبح نہا دھو کر تیار ہوئے، ناشتہ کیا اور اسکول چل دیئے۔ وہاں سے اسپورٹس میں حصّہ لے کر شام کو گھر پہنچے تو یہ خود اپنی نماز اور وظائف میں مشغول رہتے۔ اتنی دیر بچے کھیلتے رہتے۔ پھر رات کے کھانے کے بعد جب یہ بچوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ہوم ورک لے کے بیٹھ جاتے۔ بمشکل کسی چھٹی کے روز بچے ان کے ہاتھ پھنس جاتے تو دانستہ طور پر ایسی شرارتیں کرتے کہ پٹائی ہونے لگتی اور سب بھاگ نکلتے۔ ایک دفعہ سب بچوں کو قبلہ رُخ بٹھا کر یہ سکھا رہے تھے کہ سجدہ کیسے کیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے سجدہ کرنے لگے تو عائشہ نے کہا ڈیڈی قبلہ آپ کے پیچھے ہے۔ آپ تو ہم کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اور نواب صاحب نے چپ مردود کہتے ہوئے سجدے سے سر اُٹھایا اور عائشہ کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ عائشہ لڑھک گئی اور باقی سب کھسک گئے۔

"چار بج گئے اور زلیخا نہیں آئی"

وقت گذرتے لگا۔ بچے بڑے ہونے لگے، جنگ چھڑ گئی اور پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ نواب صاحب کی جاگیروں میں کہیں فوجیوں کی بیرکیں بننے لگیں اور کہیں سے ریل کا راستہ نکلنے لگا۔ آبکاری اور دیسی مصنوعات کے فروغ سے مالگذاری ہر سال بڑھنے لگی۔ بیگم صاحبہ کے خیال میں گھر کی بہت سی چیزیں فرسودہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک روز سجاوٹ کے ایک ماہر نے آکر گھر کا نقشہ بدلنا شروع کیا۔

نواب صاحب کا وہ مشہور دسترخوان جس پر روزانہ کم سے کم بیس پچیس مہمان ان کے ساتھ شریک رہتے راشننگ کے نفاذ کی وجہ سے پہلے ہی محدود ہو چکا تھا۔ اب وہ بھی اُٹھ گیا اور اس کی جگہ ڈائننگ ٹیبل لگ گیا۔ نواب صاحب نے کہا بھی کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا سنّت ہے مگر بیگم صاحبہ چڑھ گئیں کہ سنّت ہی تو ہے فرض تو نہیں۔ نواب صاحب نے سمجھایا کہ اس طرح میز پر بیٹھ کر کھانا جائز نہیں کہ پیر میں جوتے رہیں۔ بیگم صاحبہ نے فوراً جواب دیا کہ تم جوتے اُتار کر کرسی پر بیٹھا کرو، ہم جہنمی تو جوتے پہن کر ہی کھائیں گے۔ اصل میں بیگم صاحبہ کو یہ اچھا نہ لگتا تھا کہ بچوں کے دوست جب کبھی چھٹیوں پر آیا کریں اور یہاں دسترخوان پر بیٹھ کر کھا کے جائیں تو وہ دوسرے

دن اسکول میں مذاق اڑائیں۔ جب ہر جگہ میز کرسی پر کھانا ہونے لگا ہے تو ہم بھی ایسے ہی کھائیں گے اور اللہ نے ہمیں اتنی توفیق بھی دی ہے کہ ہم شاندار اور قیمتی ڈائیننگ ٹیبل رکھیں۔

نواب صاحب کو یہ عام تبدیلی بھی گراں گذری کہ پہلے شادی بیاہ کے موقعہ پر صبح، دوپہر اور رات کو کھانا ہوتا تھا اور اب صرف چائے یا ٹھنڈے شربتوں سے تواضع ہوتی ہے پھر بھی اتنی تسلی تھی کہ جنگ ختم ہونے کے بعد پھر وہی رسم شروع ہو جائے گی۔ نواب صاحب کو پتہ نہ تھا کہ جنگ ختم ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات ختم نہیں ہوتے۔ ایک رسم بدلتی ہے تو پھر پرانی وضع پر نہیں لوٹتی بلکہ ایک نیا ہی روپ دھارتی ہے یا اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

گھر میں ریڈیو بھی آگیا۔ ہر وقت گانے اور ڈرامے لگے رہتے۔ سب بچے اپنی ماں کے ساتھ ریڈیو ہی کے اطراف ہر وقت جمع رہتے اور آئے دن اسے بگاڑتے رہتے۔ نواب صاحب کو یاد ہے کہ ان کے بچپن کے زمانے میں ریڈیو تو نہ تھا البتہ بھونپو والا گراموفون ضرور تھا جو ہر وقت ان کی ماں کی نگرانی میں مقفل رہتا۔ عید بقرعید، ختنہ، بسم اللہ یا روزے رکھائی کی تقریب پر ہی اس کو چابی لگتی تھی۔ باقی اللہ اللہ خیر سلاّ۔ اب یہ حال ہے کہ ریڈیو گرام آگیا تو ہر وقت ریکارڈوں کی بھرمار ہے۔ طرح طرح کے چرگانے چلتے رہتے ہیں، نعت یا قوالی کا ذوق کسی کو نہیں۔ اور آجکل تو ریڈیو سیلون کی وجہ سے ریڈیو گرام بھی بیکار ہو گئے۔ روز صبح کو تین گھنٹے اور شام کو چار گھنٹے ہر طرح کے فلمی گانے بجتے رہتے ہیں۔ ریڈیو سیلون لگا ہوا ہے اور سب ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں۔ نواب صاحب کا کوئی ملاقاتی آجائے تو اسے نواب صاحب کی خوابگاہ میں بھیج دیتے ہیں۔ اور رضیہ اور شوکت تو اپنے امتحان کی تیاری بھی اسی ریڈیو کے پاس بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ایک طرف فلمی گانے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف پڑھائی بھی ہو رہی ہے۔ خدا ہی جانے ان کم نصیبوں کے امتحان میں سوال کیا ہوتے ہیں کہ یہ پاس بھی ہو جاتے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ عبدالرزاق صاحب جو معاشیات کے وظیفہ یاب لکچرر ہیں اور کبھی کبھی نواب صاحب کے پاس آتے رہتے ہیں، سبحان سے پوچھ رہے تھے۔ بیٹا بتاؤ تو یہ اسمال سیونگز اسکیم کیا ہے اور اس کے فائدے کیا ہیں؟ سبحان الو کی طرح آنکھیں جھپکانے لگا۔ وہ الو کا پٹھا معاشیات سے بی اے کر رہا ہے اور اتنا نہیں بتا سکا۔ مگر کونسی فلم میں کون کون کام کر رہا ہے، کونسا گانا کس

میوزک ڈائرکٹر کا ہے اور کونسی ایکٹریس کو کس ایکٹر سے بچہ ہوا، یہ سب اسے معلوم ہے اور بحث کرتا ہے۔ ناہنجار کہیں کا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کہ نواب صاحب بھی سبحان کی عمر کے تھے اور ثقیل سے ثقیل فارسی شعر کا مطلب سمجھا سکتے تھے۔

پھر ایک دن گھر کا بیت الخلا کھُدنے لگا۔ پتہ چلا کہ ہر خواب گاہ کی بغل میں فلش سسٹم والا تعمیر ہوگا۔ نواب صاحب جھلا کر رہ گئے کہ اب یہ کام بھی انگریزی طریقے سے کیا جائے گا۔ اب یہ ناخلف لونڈے اور ان کی بیوقوف ماں ان سے پانی کا استعمال چھڑوا کر رفتہ رفتہ اُن سے کاغذ کا استعمال کروا کے ہی چھوڑے گی۔ لعنت ہے اس زندگی پر جس میں انسان اپنی مرضی کا سنڈاس بھی نہ کر سکے!

"سوا چار..." کُکو کلاک نے دُور ہی دُور سے نواب صاحب کو وقت بتلایا اور شاید اپنی زبان میں وہ بھی کہہ رہی تھی کہ زلیخا اب تک نہیں آئی۔

گھر کا جغرافیہ بدلنے پر نواب صاحب کو جو غصہ آتا تھا اس سے بڑھ کر خاندان کی تاریخ بدلنے پر آتا تھا۔ لڑکیاں جب کانونٹ اسکول میں شریک ہونے لگیں تو انھوں نے مخالفت تو کی تھی لیکن بیگم صاحبہ کی ضد اور منطق اور کچھ ان کی بھی زن مریدی سے وہ مخالفت کامیاب نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے سوچا لڑکیاں دو چار سال یہیں پڑھ لیں تو پھر انھیں یہاں سے نکلوا کر لڑکیوں کے اسکول میں شریک کروا دیں گے۔ مگر بیگم صاحبہ نے یہ نوبت ہی نہ آنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے لڑکیوں کا سنِ بلوغت قریب آنے لگتا تو نواب صاحب کی الجھن بڑھنے لگتی۔ اسکول ہی کی تعلیم سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اس پر مخلوط تعلیم کا ماحول ان کی نظر میں دُنیا ہی میں جہنم کا نمونہ تھا۔ —— ان کو ڈر لگا رہتا کہ ان کی کوئی صاحبزادی وہاں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھیں اور بیگم یہ سمجھایا کرتیں کہ جتنی لڑکیاں وہاں پڑھتی ہیں کیا سبھی ایسی حرکت کر بیٹھتی ہیں۔ میں تم کو ایسی کتنی ہی لڑکیوں کے نام گنوا سکتی ہوں جنھوں نے یہاں اور یہاں کے بعد کالج میں بھی لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائی اور تعلیم ختم کر کے باپ کی مرضی کے لڑکوں سے شادیاں کیں اور اپنے گھر بسا کر وہ آج آباد اور سُکھی ہیں، جن لڑکیوں کی تربیت اچھی نہیں ہوتی ان کے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ ہماری بچیاں سمجھدار ہیں اور ان کی تربیت اچھی ہے۔ ان سے کوئی ایسی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ تربیت والی بات نواب صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور وہ ہر نماز میں دعا کرتے رہتے کہ خُدایا ان بچّوں کو نیک توفیق دے۔ تو ہی ان کا مالک اور نگہبان ہے۔ نواب صاحب کو اس بات کا بڑا سخت دُکھ تھا کہ جس خاندان کی کسی لڑکی کا ناخن تک کسی نامحرم نے نہ دیکھا تھا آج اُسی خاندان کی کچھ لڑکیاں غیر مذہب و ملّت کے لڑکوں کی صحبت میں بالغ ہو رہی تھیں۔

زن مُریدی سے وہ اتنے مجبور نہ تھے جتنے زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات سے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اچھے اچھے اشراف اور رئیسوں کے ہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔ ورنہ ایک آن میں وہ اپنی زن مریدی کی زنجیر توڑ کر رکھ دیتے۔

نواب صاحب کے جذبات پر خاموشی کی مہر اس دن پُوری طرح لگ گئی جب کہ بیگم صاحبہ اپنی بہنوں، بھاوجوں اور دوسری بیگمات کے ساتھ بے پردگی کی حالت میں نمائش گھوم آئیں۔ اب تو نواب صاحب سب کچھ دیکھتے، بہت کچھ محسوس کرتے اور کیا نہیں کہنا چاہتے مگر کچھ نہیں کہتے۔ ضبط کر جاتے۔

"ساڑھے چار بج گئے اور زلیخا کا پتہ نہیں"، ککو کلاک نے کہا اور نواب صاحب نے سوچا۔

جنگ ختم ہوئی اور مسلم میاں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ چند ہی سال بعد انھوں نے لکھ بھیجا کہ اب وہ ہندوستان نہیں لوٹیں گے، وہیں انھوں نے ملازمت کر لی۔ گھر بھی لے لیا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ نواب صاحب کے بچپن میں ان کے چھوٹے ماموں ولایت سے ایک میم بیاہ کر لائے تھے تو خاندان والوں میں سے کسی نے بھی ان کا اور ان کی میم کا منہ نہ دیکھا اور وہ ایک دوسرے ہی شہر میں جا کر بس گئے اور نواب صاحب کے والد اپنی آخر عمر میں وصیت نامے کے ذریعہ جائداد کا فیصلہ کر کے مدینہ منوّرہ جا کر بس گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔

خالد نے بی اے کی تعلیم ترک کے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کر لی تھی اور تلنگانہ تحریک کے دوران میں پولیس دستے سے ایک جھڑپ میں اسے گولی لگی اور وہ مر گیا۔ نواب صاحب کو پتہ تھا کہ کمیونسٹ کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ خدا۔ اس لئے خالد کے مرنے کا انھیں کوئی غم نہ ہوا اور بیگم صاحبہ نے ہی فاتحہ خوانی کروائی تھی۔

عائشہ ایف آر سی ایس کرنے کے لئے انگلینڈ گئی اور ایک انگریز طالب علم سے شادی کر کے

وہیں رہ گئی۔ اس خبر کے بعد ہی نواب صاحب پر دل کا پہلا دورہ پڑا تھا۔ جذبات آخر کب تک گھٹے رہتے۔ لاوا اپنے بہہ نکلنے کا وقت اور راستہ خود ہی مقرر کرتا ہے۔ اگر خودکشی کرنا حرام نہ ہوتا تو کیا پتہ وہ خودکشی بھی کر لیتے۔

مبارک نے تعلیم سے پہلے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی کیونکہ وہ ان کے مزاج سے میل نہ کھاتی تھی۔ انھیں بچپن ہی سے بُری صحبتوں کا شوق رہا تھا۔ جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ماہر جواری سمجھے جاتے تھے۔ راتیں بھی لڑکپن سے کوٹھوں پر گذاریں۔ تنگ آکر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ کسی رنڈی کے یار کا خون کر کے فرار ہو گئے تھے مگر گرفتار ہو گئے اور آجکل مقدمہ چل رہا ہے۔

محمود میاں سات سال پہلے ایکٹنگ کے جنون میں بمبئی چلے گئے۔ ہر مہینے باقاعدگی سے ان کی ماں ان کو اخراجات کے لئے منی آرڈر بھیج دیتی ہیں۔ سنا ہے اسٹوڈیوز میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اب تک کوئی کام نہیں ملا اور سر کے بال سفید ہو رہے ہیں۔ ایک مرہٹن اکسٹرا لڑکی کو گھر میں ڈال رکھا ہے۔

سبحان صاحب ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہیں اور روز ایک نظم کہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ایک پیدائشی شاعر ہیں اور مُلک اور سماج کو ان کی سخت ضرورت ہے۔ مُلک اور سماج کا یہ نجات دہندہ ہر وقت فلمی رسالے پڑھتا ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اسمال سیونگز اسکیم کیا ہے۔

"پونے پانچ۔۔۔۔"

زلیخا کا اب تک پتہ نہیں۔ یہ زلیخا جو سینئر کیمبرج میں دو سال سے فیل ہو رہی ہے، جس کو روز ایک نئی ساری اور نیا بلاؤز چاہیئے اور نئے فیشن کے زیور اور سینڈل چاہئیں، جس کو بہت ہی اعلیٰ اور قیمتی غیر مُلکی خوشبوئیں اور سنگھار کا سامان چاہیئے۔ جو ہر ہندی اور انگریزی فلم دیکھتی ہے۔ ہر مقبول گانے کا ریکارڈ خریدتی ہے، جس سے ملنے کے لئے لڑکے وقت بے وقت آتے رہتے ہیں اور ہر ہفتے اور اتوار کی رات کو باہر ہوٹلوں میں غیر مَردوں کے ساتھ ڈنر اور ڈانس کے لئے جاتی ہے، وہ زلیخا اب تک نہیں آئی اور کیا پتہ

آئے گی بھی یا نہیں۔ بیگم صاحبہ تو یہ کہہ کر چپ ہو گئیں کہ ہمیں اپنی تربیت پر بھروسہ ہے۔

رضیہ اور شوکت ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ رضیہ کی عمر گیارہ سال ہے۔ وہ گھر میں رہے گی، یا اپنے کمرے میں اکیلی ہی رہے گی، تب بھی اس کے لپ اسٹک لگی رہے گی۔ اسے اپنے لباس کی بھی اتنی ضرورت اور پروا نہیں معلوم ہوتی جتنی لپ اسٹک کی ہے۔

شوکت میاں گھر میں ہر وقت جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کو بھی "تو" کہہ کر مخاطب کرنے میں شرم نہیں محسوس کرتے۔ کئی دفعہ باپ کو مارنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ رضیہ سے صرف ایک سال چھوٹے ہیں۔ دس سال کی عمر ہے۔

حکیم صاحب کو سب پتہ ہے۔ اسی لئے خمیرہ مروارید اور جواہر مہرے کی گولیوں کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ دل پر کوئی صدمہ گذرنے نہ پائے۔ نواب صاحب انھیں کیسے سمجھائیں کہ کسی صدمے سے انھیں پیار نہیں۔ وہ کسی بھی صدمے کو دعوت نہیں دیتے۔ صدمہ تو یکایک آجاتا ہے اور ایک کے بعد ایک آتا ہی رہتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے یہ نہیں معلوم۔ کیسے آتا ہے یہ اس پر غور کرتے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں آتا ہے اسے وہ مقدر کا لکھا سمجھتے ہیں اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا اور صبر و رضا سے کام لینا اُن کا ایمان ہے۔

مالی حالت بھی اس قابل نہیں کہ وہ ان سب کو اُن کے حال پر چھوڑ کر کہیں الگ جا رہیں۔ جنگ ختم ہوئی، غلامی ختم ہوئی، جاگیرداری ختم ہوئی کسی کو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ وقت اس طرح بدل جائے گا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے خیال میں وہ زمانہ ویسا ہی رہنے والا تھا۔ وہ حالات ویسے ہی رہنے والے تھے، وہ خوشحالی امر تھی اور وہ دور کبھی نہ بدلنے والا تھا۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ یہ نہیں سوچا کہ اللہ کا دیا بھی تو کبھی ہمیشہ نہیں رہتا۔

نواب صاحب کے تو ہاتھ میں کچھ تھا ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ سارے گھر کی کنٹرولر اور پالیسی میکر تھیں۔ ہر کھانے میں طرح طرح کی لذتیں اور نعمتیں، اپنے اور سب کے لباس میں ایک شانِ نمود، گھر کے رکھ رکھاؤ میں ایک رعب و جلال، ایک ایک بچے کے لئے الگ الگ

نوکر اور ہر ایک کام کے لئے ایک ملازم تین تین چار چار موٹریں، سیر تفریح، پکنکیں، دعوتیں، سفر، بیگم صاحبہ نے اصراف کا کوئی بہانہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ سالانہ جو آمدنی جاگیرات سے ہوتی تھی وہ ساری خرچ ہو جاتی۔ سیٹھ ہری کرشن موتی لال کا قرضہ الگ۔ پھر مسلم اور عائشہ کو سمندر پار بھیجنے کا خرچ اور وہاں کی تعلیم کے اخراجات جس کے بعد مسلم اور عائشہ نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجی۔ محمود اور ان کی داشتہ کی بمبئی میں پرورش، جاگیروں کے خاتمے پر جاگیروں کا معاوضہ تو ملا مگر بیشتر حصہ ہری کشن موتی لال کے سود در سود اور اصل کی کچھ قسط میں چلا جاتا اور اس سال معاوضے کی اقساط بھی پوری ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ کے سارے زیورات پہلے ہی گروی ہو چکے تھے۔ اب گھر کا فرنیچر اور آرائش کی قیمتی اور نایاب چیزیں فروخت کی جا رہی تھیں، جن کے دام مشکل سے کوئی لگاتا۔ نواب صاحب اور ان کے خاندان کے افراد آج ایک ایک چیز کے لئے محتاج تھے۔ نواب صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اخلاقی ابتذال کا زہر ہمارے سماج کی رگوں میں کیسے سرایت کر گیا۔ انھیں افسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ دیکھنے کو زندہ رہ گئے۔

اور ایک دن بیگم صاحب زلیخا سے کہہ رہی تھیں تم لوگ خوش نصیب ہو جو ایسے روشن زمانے میں پیدا ہوئے۔ عائشہ کو دیکھو کتنی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اس نے اپنی پسند کی شادی کی۔ ہمارے زمانے میں مجال نہ تھی کہ ہم اپنے منہ سے کہتے کہ ہم کس سے شادی کریں گے۔ اور تو اور شادی کے بعد بھی اب تک تمھارے ڈیڈی کا نام ہم نے زبان پر نہیں آنے دیا۔ اور زلیخا نے جواب دیا کہ ہم سے تو آپ نے اچھا زمانہ دیکھا ہے، جو سکھ آپ لوگوں نے دیکھا ہے وہ ہمیں کہاں نصیب۔ پہلے تو ہر طرف نوٹ اڑتے تھے، اب دھول اڑ رہی ہے۔ رہی شادی تو وہ زندگی کا مقصد تو نہیں ایک ذریعہ ہے۔ کسی سے بھی ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے۔

"پانچ بج گئے اور زلیخا اب بھی نہیں آئی"

صبح کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ نواب صاحب چونکے کچھ سوچ کر اٹھے۔ باتھ روم میں جا کر وضو کیا۔ پھر بڑے خضوع و خشوع سے نماز ادا کی، رات بھر جاگتے رہنے اور زلیخا کی فکر سے اپنے آپ کو اس قابل نہیں پایا کہ وظائف پڑھ سکیں۔ مصلّی لپیٹ کر رکھ دیا۔

اور حسبِ عادت باغ میں ٹہلنے کو چلے گئے۔ فضا میں بڑی خوش گوار خنکی تھی۔ اندھیرے کو اُجالا آہستہ آہستہ مگر پوری قوت سے پیچھے دھکیل رہا تھا۔ سپیدی مائل سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ پتیوں اور پھولوں پر شبنم کے چراغ جل رہے تھے۔ ہر طرف سوندھی سوندھی خوشبوؤں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ لیکن نواب صاحب فطرت کی بزم آرائیوں سے بے پروا زلیخا کی فکر میں ٹہل رہے تھے۔ انھیں ٹہلتے ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ دُور پھاٹک پر موٹر کار کے رُکنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً ایک درخت کی آڑ میں ہو کر دیکھنے لگے۔

سیٹھ ہری کشن موتی لال کی کار سے زلیخا اُتر رہی تھی! زلیخا دبے قدموں گذرنے لگی اور اس درخت کے پاس سے بھی دبے قدموں گذر گئی جس کے پیچھے نواب صاحب کھڑے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی جس میں رضیہ اس کے ساتھ شریک تھی۔ رضیہ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔

"آپا۔ اکیلے میں ڈر کے مارے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کہاں تھیں رات بھر؟"

"یہ بتا رات کو ڈیڈی جلدی سو گئے تھے؟"

"ہاں۔ ممّی نے انھیں جلدی سُلا دیا تھا۔"

"میں بھی اب سو جاؤں گی، تو یہاں کوئی آواز نہ کرنا۔ ڈیڈی پوچھیں تو کہنا میں گیارہ بجے آگئی تھی اور ممّی سے کہہ دینا کہ سیٹھ جی ہمارے گھر پر اب قرقی نہیں لائیں گے۔"

"ہوں!" رضیہ صرف اتنا ہی کہہ سکی اور اس کا ذہن جولانیاں دکھانے لگا۔

"اب ٹھیک وقت کیا ہوگا رضیہ؟ میری گھڑی بہت تیز ہے۔"

"معلوم نہیں آپا۔ بہت دیر ہوئی ککو کلاک نے سوا پانچ بجائے تھے۔ پھر معلوم ہوتا ہے وہ بند ہو گئی۔"

نواب صاحب درخت کے تنے سے لگے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں کھُلی تھیں اور عملِ تنفس بند تھا۔

●●

ڈوبتے ابھرتے تنکے

ایک ٹرک دندناتی چلی گئی۔ سمنٹ کی سڑک پر اُس کے پہیوں کی تیز رفتار پھڑپھڑاہٹ سے سرسراہٹ میں بدلنے لگی اور اُس کے تعاقب میں دوڑنے والے کتّوں کی بھونکیں دُور ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے کوّے جو اس خلل سے چڑھ گئے تھے، بہت شور مچا رہے تھے۔ قریب ہی بھاری بُوٹوں کی چاپ سُنائی دی۔ برابر کی کوٹھی میں کسی کی زنجیروں کو حرکت ہوئی۔ لیکن وہ ان سب آوازوں سے بے خبر چُپ چاپ اور گم سُم بیٹھا تھا۔ کیونکہ اس کی دُنیا میں موت کا سناٹا تھا۔

اس نے ایک دفعہ اور گھٹنوں سے اپنا سر اُٹھایا اور بھیگی آنکھوں سے خلا میں تکنے لگا۔ اس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ اس کی سانسوں میں موت لہرا رہی تھی۔ اُس کی موت کو بس تھوڑی دیر اور تھی۔ اُس کی زندگی تھوڑی دیر اور تھی۔ پھر ایک مقررہ وقت پر اور مخصوص لمحے میں اُس کی زندگی کے تنگ ڈربے کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا جائے گا۔ اس مخصوص لمحے کے انتظار میں اس نے صدیاں گذار دی تھیں، مگر دلی تمنا یہ تھی کہ وہ لمحہ نہ آئے اور وہ صدیوں جیتا رہے۔

ویسے اسے انتظار کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ انتظار نہ بھی کرتا تو اس لمحے کو آنا ہی تھا اور وہ آ ہی رہا تھا۔ اور جیسے جیسے اس کا فاصلہ کم ہو رہا تھا اُس لمحے کی ایک خوفناک شکل بنتی اور واضح ہوتی چلی گئی۔ ایک ایسی شکل جسے وہ خود بھی بیان نہ کر سکتا تھا، لیکن سوتے اور جاگتے وہ اسے صاف دیکھتا رہتا تھا۔ اُس سے کسی طرح اس کا پیچھا چھوٹتا ہی

نہ تھا۔ کرب اور بیچینی سے وہ اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا، جو اُسے موت سے زیادہ تکلیف پہنچا رہا تھا۔

موت ناگزیر ہے، شاید اس لئے کہ "موت زندگی کی سزا ہے"۔ لوگ حادثوں سے مرتے ہیں، بیماریوں سے مرتے ہیں، خودکشی سے مرتے ہیں، لیکن کسی کو ایسی اذیت نہ ہوتی ہوگی جو پھانسی سے مرنے والے کو ہوتی ہے، اور وہ بھی ایسے شخص کی پھانسی جو اس کا سزاوار ہی نہ ہو۔

اُس کو پھانسی کی سزا اس لئے دی جا رہی تھی کہ مبیّنہ قتل کے بارے میں ساری شہادتیں شدید طور پر اس کے خلاف تھیں، اور ان کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اپیلیں بھی مسترد کر دی گئیں۔ قانون تو اندھا ہوتا ہی ہے، بے گناہ بھی اس کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

وہ ایسا آدمی بھی نہیں تھا جو کسی کا خون کر سکے۔ وہ تو اُن لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں سے تھا جو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن کے سونے جاگنے، کام اور آرام کے اوقات بندھے بندھائے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ جن کے لئے سب سے بڑی راحت اس میں ہوتی ہے کہ کوئی نوکری کر لیں اور گھر کا خرچ چلتا رہے۔ جن کی دُنیا صرف دو ستونوں پر قائم ہوتی ہے، گھر اور دفتر۔ جن کا مزاج بہت ہی صلح پسند ہوتا ہے۔ کسی ایک چانٹا کھا کر وہ اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کر دیتے ہیں۔ جو اپنے ذریعۂ آمدنی اور مستقبل کے تحفّظ کے لئے اپنی غیرت کو حجذام میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جن کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ دُنیا کیا ہے۔ کب سے ہے؟ کس کے لئے ہے؟ کیا ہوتا رہا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ہوگا؟ وہ کبھی اخبار بھی دیکھتے ہیں تو صرف سنسنی خیز خبریں پڑھ لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کسی حسّاس مفکّر کی رائے میں کوئی زندگی ہی نہیں، نہ سہی، مگر اُن کے اپنے لئے تو آخر زندگی ہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُن کو بھی پھانسی کی سزا مل سکتی ہے اور ملتی ہے چاہے سزا پانے والا بے گناہ ہی کیوں نہ ہو۔

اُسے صرف یہی فکر نہ تھی کہ اس کی زندگی اب ختم ہونے ہی کو ہے، جس کے خیال سے

بار بار اسے اپنے حلق سے بگولے اُٹھ کر ذہن کی طرف بلند ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگتے، بلکہ اسی فکر سے پیدا ہونے والی اور بہت سی فکریں بھی تھیں۔ اس کی بیوی کا کیا ہوگا جس سے وہ بہت پیار کرتا ہے اور جو اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے ان دو بچوں کا کیا ہوگا جن میں ایک پانچ سال کا ہے اور دوسرا چار سال کا۔ اس کے باپ کا کیا ہوگا جو بڑھاپے کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں کا انجام کیا ہوگا جو کسی نہ کسی بیماری میں ہمیشہ مبتلا رہتی ہے۔ ان سارے مسائل کا حل اس کی زندگی سے وابستہ تھا اور اپنی زندگی سے ایک طویل عرصے تک وابستہ رہنے کا کوئی امکان اُسے دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کے تصوّر کے پیشِ منظر میں ایک بڑا اور مہیب پھانسی کا پھندہ تھا جس کے حلقے میں اُسے اپنے علاوہ پانچ اور چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ یہ پانچوں اس کے بعد جیتے جی رو رہے ہوں گے۔ ان سب کی زندگی ہمیشہ موت کے ایک طویل اور مسلسل عمل کے دباؤ میں رہے گی۔ پہلے تو خود اسے یہ سزا نہیں ملنی چاہیئے اور اگر ضروری ہی ہے تو صرف اسی کو ملے۔ ان پانچوں کو بھی اس کے ذریعے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے پانچ اور سب کے سب ایسے افراد کو جو خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے زندہ رکھے ہوئے تھا اور زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتا ہوا اپنا سماجی اور اخلاقی فرض ادا کر رہا تھا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں یہ فرض کس پر عائد ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے۔

جو کچھ بھی وہ سوچ رہا تھا تو موت کے مقررہ وقت کے علم نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اسے یہ علم نہ ہوتا، اگر وہ پھانسی سے مرنے والا نہ ہوتا، بلکہ کسی حادثے سے اس کی فوری ہلاکت ہو جاتی تو اس حادثے سے پہلے وہ کیا سوچتا؟ وہ ہرگز یہ نہ سوچتا کہ اگر میں اچانک مر جاؤں تو میری بیوی، میرے بچوں اور میرے ماں باپ کا کیا ہوگا۔ اُن کے اچانک مرنے سے اُن کا جو حال ہوتا اس کے غیر اچانک طور پر مرنے سے ہوگا۔ کوئی مرے، کسی طرح مرے، کبھی مرے، کسی کے مرنے سے دُنیا کا، کسی ریاست کا، کسی سماج کا، کسی خاندان کا کاروبار نہیں رُکتا، نئی راہیں نکلتی رہتی ہیں اور نئے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اُسے یہ سوچنے اور سمجھنے کا شعور ہی کہاں تھا۔ اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ شعور اُسے ہوتا

بھی تو اس کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی کا اداس چہرہ، اس کے بچّوں کی معصوم شکلیں، اور اس کے ماں باپ کی غمگین صورتیں مجسّم سوال بنی اسے تکتی رہتیں۔ کیونکہ شعور اور جذبات میں ہمیشہ رقابت رہی ہے اور جب زندگی اور موت کے درمیان چند ہی لمحوں، چند ہی قدموں اور چند ہی سانسوں کا فاصلہ رہ جائے تو شعور کی موت پہلے ہی واقع ہو جاتی ہے۔

اپنے خاندان کے مستقبل کو تاریک دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ پیچھے ہی اس کا ماضی کھڑا تھا۔ وہ بھی تاریکی میں تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنی ساری زندگی کا جائزہ لیا۔ جبکہ اس کی زندگی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کتنی سپاٹ تھی، بے مزہ اور پھیکی تھی، اس میں کہیں بھی کوئی رنگ نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے سے یوں گزرتا چلا گیا جیسے گھڑی کی سوئیاں اپنے نشانوں پر سے گزر جاتی ہیں۔ اس میں زندگی کا ولولہ کبھی نہیں تھا۔ وہ ایک اَن دیکھی اور انجانی راہ پر سر جھکائے چلتا رہا۔ نہ اس نے اپنی کوئی منزل معیّن کی تھی اور نہ اس منزل کی اُس نے کبھی افق میں جستجو کی تھی۔ کیونکہ وہ اس قسم کا انسان ہی نہ تھا۔ وہ ایسے پیدا ہوا جیسے عام طور پر بچّے پیدا ہوتے ہی ہیں۔ اس کی پیدائش میں کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ اس کی پرورش بھی اسی طرح ہوئی جیسے نچلے متوسّط طبقے کے بچّوں کی ہوتی ہے۔ نہ تو اس کی خاص طور پر تربیت کی گئی نہ کوئی اسے اعلیٰ تعلیم ہی ملی۔ اُس نے جیسے تیسے میٹرک پاس کیا، پھر اُسے ایک معمولی سی نوکری مل گئی۔ اس کے بعد ماں باپ نے اپنی حیثیت برابر گھرانے کی ایک لڑکی پسند کر کے اس کی شادی کر دی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گذارنے لگا۔ پھر اس کے دو بچّے بھی ہو گئے۔ وقت کے بہاؤ میں واقعات نمودار ہوتے رہے اور ان واقعات کے ساتھ وہ بھی بہتا چلا گیا۔ اسے زندگی بھر میں صرف تین دفعہ انتہائی مسرّت ہوئی تھی اور تینوں دفعہ اس نے اپنے آپ کو ایک نیا اور ذمّہ دار انسان محسوس کیا تھا جب اس کا میٹریکیولیشن کا نتیجہ نکلا تھا، جب اُس کی شادی ہوئی تھی اور جب اس کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تھا۔ (اس کے ماں باپ کو بھی اس کے پیدا ہونے پر اسی طرح بڑی خوشی ہوئی ہو گی، لیکن اب وہ کتنے دُکھ کے ساتھ اس کی لاش جیل سے لے جائیں گے۔ یہ اس کے ضعیف باپ اور بیمار ماں کی مشترکہ سوانح حیات ہے۔)

یہ تین سنگِ میل بناتے، ہیں کہ اس کی زندگی کتنی طویل یا مختصر تھی۔ اگر یہ پیمائش وقت کے حساب سے کی جائے تو اس نے ایک ہندوستانی کی اوسط عمر کا نشان طے کر لیا تھا۔ لیکن کسی حصول کے لحاظ سے کی جائے تو وہ ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور زندہ رہنے کے لئے مرا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو ابھی دُنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اور اگلا جنم بھگوان جانے ہے بھی کہ نہیں۔ پہلے جو اسے جنم جنم کے چکر پر اعتقاد تھا وہ اب اُٹھ چکا تھا۔ ایک جیوتشی نے اُسے بہت دن ہوئے بتایا تھا کہ پچھلے جنم میں اس نے اس ناجائز نوزائیدہ کو جو اس سے اس کی محبوبہ کو ہوا تھا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس بات پر اس نے فوراً یقین کر لیا تھا اور اس پر وہ ہمیشہ افسوس کیا کرتا تھا۔ اس لئے پوُجا پاٹ اور دھرم کرم کے معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتا۔ اور جب اسے پھانسی کی سزا سُنائی گئی تو اُسے خیال ہوا تھا کہ یہ اصل میں اسے اِس قتل کی نہیں، اُس خون کی سزا ملی۔ دماغ پر بہت زور دینے کے باوجود اسے اپنے پچھلے جنم کا وہ واقعہ یاد نہیں آ رہا تھا جس کی سزا وہ اب بھگتنے والا ہے۔ شاید اس کے سوچنے کا مطلب یہ تھا کہ پچھلے جنم میں اسے سزا مل جاتی تو سزا کا مقصد پُورا ہوتا یا اسی جنم میں سزا ملتی تھی تو وہ بھی ایک ناجائز نوزائیدہ ہوتا اور اس کی ماں کا یار، پچھلے جنم کا حرامی، اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

ایک تو اس کا ماضی، اور پھر اس کے ماضی کا بھی ماضی، اور نہ جانے یہ سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔ اس سلسلے کی جُستجو لاحاصل ہے کیونکہ ابھی جس ماضی کی تشکیل ہوئی ہے وہ ایک ناقابلِ گرفت حقیقت سے قابلِ فراموش فریب میں بدل چکا ہے اور فریب کی رسّی تھام کر تاریکیوں میں جتنی دُور تک چاہے کوئی چلتا چلا جائے وہ اپنے آپ سے فریب کے سوا کچھ نہیں۔

ماضی کے تمام گم شدہ لمحوں کو اس نے چُن چُن کر ایک جگہ سلسلہ وار جوڑا اور ہر ایک کے ساتھ اُس کی تفصیل بھی مِلا کر رکھ دی اور اُن پر نظر ڈالی۔ مگر وہ آنے والا آخری لمحہ جبکہ وہ آخری سانس لے گا اس کی خلا میں متحرک نظر سے لٹک رہا تھا اور اس کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے اسے کوئی بازیافتہ لمحہ صاف صاف نہ دکھائی دیتا تھا۔

جیسے اس کے ماضی، حال اور مُستقبل سبھی نے موت سے سازش کر رکھی تھی۔

ماضی میں اُس نے جنم ضرور لیا تھا لیکن ماضی نے اُسے ایسی کوئی نعمت اور موقعہ نہیں دیا تھا جس سے وہ زندگی کو سمجھ سکتا، زندگی کو سنوارتا، اور زندگی کا مزہ اُٹھاتا۔ صحیح معنوں میں اُس نے اب تک زندگی بسر ہی نہیں کی تھی بلکہ جیتا چلا آیا تھا۔

حال کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے موت کی طرف ایک ایک قدم تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ صرف رواں دواں لمحہ ہی اصل زندگی ہے لیکن جو تھوڑی ہی دیر کے بعد مرنے والا ہو اور مرنے کے انتظار میں ہو اس کا ہر گزرنے والا لمحہ بھی موت ہے۔

اس کا مستقبل جو اُسے دکھائی دیتے ہوئے بھی دکھائی نہ دے رہا تھا کہیں آس پاس ہی تھا جس سے اسے اپنے خون کی بو آ رہی تھی۔

بھگوان پر سے اُس کا ایقان ہٹنے لگا۔ جس دُنیا میں انصاف نہیں ہے وہ دُنیا کسی بھگوان کی بنائی ہوئی نہیں ہو سکتی اور جس دُنیا میں اتنی ابتری اور بُرائیاں بھری ہوں اس دُنیا کا کوئی بھگوان نہیں ہے۔

وہ بے گناہ تھا اور موت کی سزا پانے والا تھا۔ یہ سزا پوری ہو کر ہی رہے گی اور اسے مرنا ہی ہوگا۔ اس موت سے وہ نہ بچ سکتا تھا اور نہ کوئی اُسے بچا سکتا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اس سے تو اچھا تھا وہ سچ مچ قتل کا ارتکاب کرتا، اُس کی سزا جائز ہوتی اور اسے اپنی بے وقت موت کا اتنا دُکھ نہ ہوتا۔

کسی مہلک حادثے یا لاعلاج حد تک خطرناک بیماری کے مریض کو آخر وقت تک رمق برابر امید ہوتی ہے کہ شاید ایسی کوئی بات بن جائے گی جس کی بدولت وہ نہیں مرے گا۔ لیکن پھانسی سے پہلے پھانسی پانے والے کے پاس یہ امید پھٹکتی ہی نہیں۔ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ تاریخ مقرر ہو جاتی ہے اور مقررہ وقت جوں جوں قریب ہونے لگتا ہے تصوّر میں پھندہ واضح اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور پتہ تک نہیں چلتا کہ اصلی پھندے نے اس کی جگہ کب لے لی۔

جیسے جیسے صبح کا اُجالا پھیلنے لگا اُس کی آنکھوں میں تاریکی بڑھنے لگی اور اس تاریکی کو چیر کر ڈپٹی جیلر چند سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اُن کو دیکھنا ہی تھا کہ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا اور اپنے گلے میں اُسے کوئی چیز پھنستی اور اٹکتی ہُوئی سی محسوس ہوئی اور اس کا

دَم گھُٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں اتنی نم ہوگئیں کہ ڈپٹی جیلر اور سپاہی اُسے نظر نہ آتے تھے۔ لیکن نمی میں اُبھرے ہوئے ان کے خاکے بہت سے پھندوں کی شکل میں جھولنے لگے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ انسان سے یکایک وہ پتھّر کا بُت بن گیا ہے جو خود سے حرکت نہیں کر سکتا۔ بس اب سپاہی اسے اُٹھانے کے لئے بڑھتے ہی ہوں گے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور آنسوؤں کی دھاریں اس کے پچکے ہوئے گالوں پر سے بہنے لگیں۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی تنہائی کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔

اُسے بڑی حیرت بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ وہ جھنجلا گیا۔ اس طرح بار بار مرنا اسے گوارا نہ ہوا۔ وہ یکایک شدّت سے تمنّا کرنے لگا کہ اسے فوراً وہاں سے لے جایا جائے اور موت کے حوالے کر دیا جائے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو ایک مرد کی موت مرے نہ کہ اس کتّے کی جسے زہر دینے کے لئے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ گویا بے ولولہ زندگی کا کفّارہ ادا کرنے کے لئے اس نے مرنے کا حوصلہ پیدا کرلیا۔ آستینوں سے اس نے آنسو پونچھ لئے اور ہتھیلیوں سے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔ ٹھنڈی سانس لی اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سپاہیوں کا انتظار کرنے ہی لگا تھا کہ ڈپٹی جیلر سپاہیوں کے ساتھ سلاخوں والے دروازے پر آیا اور بولا "تمھاری پھانسی کی سزا ملتوی کر دی گئی ہے۔"

اُس کے چہرے پر حیرت کا وہی تاثر پیدا ہوا جو سشنز کورٹ کے فیصلے کو سُن کر ہوا تھا جس کی بنا پر وہ مجرم قرار دیا گیا تھا اور موت کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ اس کے کان سننے لگے۔ اس نے جو کچھ سُنا تھا اس پر اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ بھی تصوّر کا کھیل نہ ہو۔

"اصل میں ہوا یہ" ڈپٹی جیلر مسکراتا ہوا کہہ رہا تھا "کہ جس خون کے لئے تم کو سزا دی جانے والی تھی وہ کسی اور نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ کل رات وہ دونوں آپس میں لڑ بیٹھے اور قاتل کے دوست نے پولیس کو جا کر سارا آنکھوں دیکھا حال بیان کر دیا اور سرکاری گواہ بن گیا ہے۔ قاتل گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب یہ مقدّمہ پھر سے چلے گا اور اس کے فیصلے تک تمھاری سزا ملتوی کر دی گئی ہے۔ سوچو تو سہی، جب تمھارے گھر والے تمھاری لاش لینے کے لئے آئیں گے اور انھیں پتہ چلے گا کہ تمھیں پھانسی نہیں ہوئی ہے تو اُن کی خوشی کا کیا حال ہوگا۔۔۔"

اور ڈپٹی جیلر نجانے کیا کیا کہتا رہا۔ بڑی امیدیں دلاتا رہا، مبارک باد دی، مگر وہ کچھ نہیں سُن رہا تھا۔ وہ سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ وہ بھی شاید یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر والے آتے ہوں گے اور ان کا اب کیا حال ہو گا۔

اس کے گھر والے باہر جمع تھے۔ اس کی بیوی کا چہرہ اداس نہ تھا۔ اس کے بچوں کی معصوم شکلیں اور معصوم لگ رہی تھیں۔ اس کا باپ خمیدہ کمر ہونے کے باوجود سینہ تانے ہوئے تھا۔ اس کے تیور کہہ رہے تھے۔ یہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا کہ میرا بیٹا خونی ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کی سزا ملتوی ہونے کی خبر جیل میں ہر طرف ناچ رہی تھی۔ اور ایک پہرے دار نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ بس دو ر یا ہ مقدّمہ ختم ہوتے ہی وہ چھوٹ جائے گا۔ مگر اس کے گھر والے قانونی ضابطے کا یہ چکر سمجھ نہ پاتے تھے۔ ان کا سیدھا سادا سوال تھا کہ جب وہ خونی نہیں، اور اصل قاتل گرفتار کر لیا گیا ہے تو اسے کیوں رہا نہیں کیا جاتا۔

وہ پہرے دار سے بحث کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی اندر سے نکل آیا اور اس طرح سے ان کی طرف آنے لگا جیسے وہ ان کا اپنا ہی کوئی آدمی ہو۔ اور بڑی ہمدردی سے بولا۔

"پھانسی کی سزا ملتوی ہونے کی خبر سُن کر وہ اتنا خوش ہوا کہ مر گیا۔ اس کی لاش لیجانے کا بندوبست کرو۔"

●●

ایک سالگرہ

آنٹی پورے پچاس کی ہو چکی تھیں۔ آج اُن کی اکاونویں سالگرہ تھی۔
"زرنگار" کے احاطہ میں اور باہر شاہراہ پر دُور دُور تک نئے نئے رنگوں اور نئی نئی وضع کی نئی نئی کاریں چمک رہی تھیں۔ کاریں آ رہی تھیں، خالی ہو رہی تھیں اور جا رہی تھیں ——— اندر ڈرائنگ رُوم، لِونگ رُومز، بیڈ رُومز، ڈائننگ رُوم اور برآمدے ہر رنگ اور ہر فرقے کے مَردوں اور عورتوں سے بھرے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی خوشبوؤں سے فضا مہک رہی تھی۔ حُسن و زیبائش کے پیکروں سے ماحول جگمگا رہا تھا۔

آنٹی بڑی خوش خلقی اور خوش مزاجی سے اپنے مہمانوں کا استقبال بھی کر رہی تھیں اور خبر گیری بھی۔ میں نے اس سے پہلے آنٹی کو کبھی ایسے سنگھار میں نہیں دیکھا تھا۔ اُنھوں نے شیفون کی سیاہ فرنچ ساڑی پہن رکھی تھی جس پر سنہرے نقوش بنے تھے۔ اس سال کی گرمیوں میں جب وہ ریورا گئی تھیں تو بیگم آغا خان نے انھیں بطور تحفہ یہ ساڑی پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ بیر بہوٹی جیسا سُرخ بغیر آستینوں کا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں جس کی تراش خاص اُن کی فرمائش پر اسی موقع کے لئے بالکل اچھوتے ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے دورانِ سیاحت میں خریدی ہُوئی پلاٹینم کی گھڑی جس کے کانٹے بھی پلاٹینم کے تھے اور ہندسے ہیرے کے۔ دائیں کلائی پر پلاٹینم ہی کے جال دار توڑے سے بندھی تھی۔ بائیں کلائی میں زمرّد کے ننھے ننھے نگینوں کا بریسلٹ تھا۔ بڑے بڑے اصلی موتیوں کا ہار سینے پر لٹک رہا تھا اور ڈنمارک کا بنا ہوا ہیروں سے مرصّع گلوبند اس کے اُوپر تھا جس کے بیچوں بیچ آنسو کی شکل میں تراشا ہوا بڑا سا نیلم چمک رہا تھا۔ کانوں کی لوؤں سے

ہیروں کے جھاڑ لٹک رہے تھے۔ دن بھر کے بیوٹی ٹریٹ منٹ کے بعد ان کی گلابی جلد کی طنابیں کھنچ گئی تھیں۔ سنگترے کے چھلکے جیسی جلد سیب کے چھلکے جیسی ہو گئی تھی۔ جدید طرز کے کٹے ہوئے بال گردن اور کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پیشانی کے درمیان سے ذرا ہٹ کر کوئی دو انگل چوڑی سفید دھاری پشت کو جاتے جاتے پھیل کر بڑی پُرکشش لگ رہی تھی، اور آنٹی کی وجاہت کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں عجیب سا نور تھا۔

ہر سال کی رسم کے مطابق جیسے ہی مرتعش چائمز نے نو بجائے جو اُن کی پیدائش کا وقت تھا، آنٹی نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا، ہر طرف سے نغمہ بلند ہوا "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو..."

"زرنگار" میں اس سے بڑی دعوت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی اور آنٹی کے ولولے دیکھ کر مجھے بیحد مسرت ہو رہی تھی، کیونکہ آنٹی پچاس سال سے زیادہ جینا وبال سمجھتی تھیں اور پچاس سے اُوپر کی زندگی کے تصوّر ہی سے گھبراتی تھیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان تھا کہ آنٹی اب زندگی کی اَن بُوجھی اور اَن دیکھی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے خوفزدہ ہونے کی بجائے ایک اور سنگِ میل کے گزرنے پر اتنی مسرور تھیں۔ پورے پچاس سال انھوں نے گزار دیئے تھے۔

پچھلے سال ہی کی تو بات ہے جب کہ میں آنٹی کے ساتھ کھنڈالا کی ایک سربلند چوٹی پر بیٹھا تھا۔ ہم اُفق تک پھیلے ہُوئے اور پہنچے ہوئے سلسلۂ کوہ اور بیچ بیچ میں اُن پہاڑوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جُدا رکھنے والی سینکڑوں فٹ گہری اور خوفناک کھائیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سبزے کا میلوں پتہ نہ تھا۔ زردی مائل پس منظر دُور ہوتے ہوتے بھورا ہو رہا تھا اور دُور آسمان اور زمین کے اتصال پر مبہم سرمئی خاکے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ منظر بڑا پُرسکون تھا مگر یہ سوچ کر دہشت ہوتی تھی کہ یہ پہاڑ جس کے سر پر ہم سوار ہیں اگر نیچے سے کھسک گیا تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ ویسے یہ سوچنے کی کوئی وجہ تو نہ تھی۔ بس ایک یُونہی سا خیال آگیا اور عجیب اتفاق تھا کہ آنٹی بھی کچھ اس قسم کی بات سوچ رہی تھیں۔

"ڈارلنگ سپوزہ میں یہاں سے گر کر مر جاؤں" وہ اپنی مخصوص زبان میں بولیں جو

ان کی عادت تھی۔ یعنی انگریزی الفاظ کا بہت استعمال کرتی تھیں اور بعض دفعہ تو جملے کے جملے بھی بول جاتی تھیں۔ "یہ سوچ کر آئی شڈر۔ میں تو مرنا ہی نہیں چاہتی۔ نہ ایکسی ڈنٹ سے، نہ سوسائڈ کر کے، نہ کسی اور طرح۔ ہاؤ ایور آئی ہیو ناٹ بیٹ ڈی سائڈڈ کہ میں کیسے مروں گی۔ موت سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"آپ موت کے بارے میں سوچتی ہی کیوں ہیں؟"

"کیوں نہیں سوچوں۔ میں مرنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن ففٹی کی ہو کر جینا بھی تو نہیں چاہتی۔ کیونکہ پھر لائف بی کس سو مزریبل، یو نو۔"

میں چکرایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سب سے آسان موت ہارٹ فیل ہے۔" آنٹی نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا۔

"اس میں کوئی لمبی چوڑی تکلیف نہیں ہوتی۔ یو نو۔ آئی ڈونٹ لائک سفرنگ۔ نہ اپنی نہ دوسروں کی۔ تم بیلیو نہیں کرو گے کہ میں نے آج تک کسی اِن سکٹ تک کو نہیں مارا۔ ہر طرح کی پارٹیوں میں پارٹی سی پیٹ کیا مگر ہنٹنگ پارٹی میں کبھی نہیں گئی کسی فیونرل میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہاؤ آئی ڈو فیس دی ڈیتھ، اسپیشلی بڑھاپے میں کبھی کبھی ڈاؤٹ ہونے لگتا ہے کہ شاید کوئی خُدا ہے اور پھر آئی پرے ٹو ہم کہ مجھے ہارٹ فیل سے مارنا اور جب میرا ایمان لوٹ آتا ہے کہ خُدا وُدا کوئی نہیں تو ڈٹرمن کرنے لگتی ہُوں کہ ہارٹ فیل سے آرام سے مروں گی تاکہ مجھے مرتے میں کوئی ٹربل نہ ہو۔"

"چلئے آنٹی دیر ہو رہی ہے۔ رات کو ہائی وے پر ٹرکیں بہت چلتی ہیں۔ بمبئی پہنچنے میں ہمیں دیر ہو جائے گی۔"

ہم پہاڑ سے اتر آئے۔ راستہ بھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہماری کار کھنڈالا کے پُر پیچ اور نیم تاریک نشیبی زاویوں سے بھی چلی جا رہی تھی ہم دونوں خاموش تھے۔ خاموشی وحشت ناک تھی۔

ویسے آنٹی شاید ہی کبھی خاموش رہتی ہوں گی اور ان کی باتوں میں بات کرنا بڑے دل گُردے کی بات ہے۔ اس بات کا احساس مجھے ان سے پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ ان

سے میری یہ پہلی ملاقات چند سال پہلے ہُوئی تھی۔

میں جس تشہیری ادارے میں ملازم تھا اس کے مالک سے میرے تعلّقات بہت ہی دوستانہ تھے وہ میری کارکردگی سے متاثر تھا اور میں اس کی خوشحالی سے۔ اکثر شامیں ہم ساتھ گزارا کرتے تھے۔ ایک دن اُس نے کہا۔

"آج میں تمھیں ایک خاص آنٹی کے پاس لے چلوں گا۔"

میں اب تک اس کی کئی اصلی اور منہ بولی آنٹیوں سے مل کر بہت بور ہو چکا تھا۔

"یہ کونسی آنٹی ہیں؟" میں نے بددلی سے پوچھا۔

"یہ دراصل ساری دُنیا کی آنٹی ہیں۔ تم انھیں شیطان کی آنٹی بھی کہہ سکتے ہو۔"

اس مختصر سے غائبانہ تعارف کے بعد ہم ان آنٹی کے بنگلے پر پہنچے۔

ڈرائنگ رُوم میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی خواب آور دوا کے زیرِ اثر میں خوابوں کے جزیرے پر پرواز کرنے لگا۔

یہ ایک ایرکنڈیشنڈ ہال تھا، جو الٹرا ماڈرن ذوق اور مزاج کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار فیروزی رنگ کی تھی۔ ایک بنفشی سُرخ ایک گہری سرمئی اور ایک ہلکے سبز رنگ کی جس پر کیوبک اسٹائل میں زرد، سفید اور نارنجی خاکے تھے جن کا موضوع سکون اور تازگی تھا۔ تازہ ترین رواج اور ڈیزائن کے پردے الگ الگ رنگوں اور ناپ کے غالیچے، الگ الگ رنگ اور وضع کے صوفوں کے نیچے بچھے تھے۔ خوش ذوقی اور حُسن کارانہ طور پر ترتیب دیئے ہوئے پھول، بیش قیمت اور نادر گلدانوں میں سجے تھے، دیواروں اور چھت کی مخفی روشنی مصنوعی چاندنی کی طرح چھٹکی ہوئی تھی۔ جس کی برائے نام روشنی میں وہاں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے مَردوں اور عورتوں کے خدوخال سے ان کی تمنّاؤں اور حسرتوں کے تاریک گوشے اُبھر رہے تھے۔ چھت سے آویزاں پُرشکوہ بلوری جھاڑ کے گوشواروں میں مخفی روشنی کے انعکاس سے صلیبیں چمک رہی تھیں۔

طرح طرح کے پھولوں اور خوشبوؤں کی مہک سے تمباکو کی بُو اور سگریٹوں کا گھٹا ہُوا دُھواں خلط ملط ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں میں سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار عورت ہماری طرف

بڑھتی چلی آئی۔ منقش سنہری فریم کے چشمے میں اسکی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دہک رہی تھیں اور پھیکے پھیکے لپ اسٹک والے ہونٹ، استقبالیہ مسکراہٹ لئے ہوئے تھے، ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ابتدائی رسمی گفتگو اور مصافحے کے بعد میرے دوست نے ان سے میرا تعارف کرا دیا۔ یہ تھیں وہ آنٹی۔

" ہاؤ ڈو یو ڈو؟ " آنٹی نے میرے جواب میں کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ رُوم کے ایک کونے میں دیوان پر انھوں نے ہمیں بٹھا دیا میرے دوست نے دُور بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں کو اشارہ کیا اور دو توں جیسے ایک دکھائی نہ دینے والے دھاگے سے بندھی چلی آئیں۔ ایک دھان پان گجراتی اور دوسری اونچی پوری پنجابی۔ بیرا بھی آگیا اور میرے دوست نے اسکاچ کا آرڈر دیا۔

" انجوائے یور سلوز بوائز "۔ یہ کہہ کر آنٹی کچھ نو وارد مہمانوں کی مدارات کو چلی گئیں۔

بوتل آئی، گلاس آئے، سوڈا آیا، جام ٹکرائے، گھونٹ اُترے، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ چلی، مگر میں اس چھیڑ چھاڑ میں شریک نہ تھا۔ مخفی روشنی کے آدھے سے زیادہ اندھیرے میں میری نگاہیں دوسری شکلوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر ایک مشہور فلمی ہیرو دکھائی دیا جس کے ساتھ ایک نامور پروڈیوسر اور ایک کامیاب ڈائریکٹر بھی بیٹھا تھا۔ ان کے حلقے میں پانچ عورتیں بیٹھی ان کے ساتھ پی رہی تھیں۔ ان تینوں کی آنکھوں سے شراب کے ساتھ ساتھ دولت اور عیاشی کا نشہ بھی آشکار تھا۔ ان پانچوں کی آنکھوں میں تجربے کاری اور خود اعتمادی کا نشہ بھرپور تھا۔ وہ ان کا شکار کر رہے تھے اور یہ ان کا شکار کر رہی تھیں۔

ایک جگہ ایک بھاری بھرکم توندیل مارواڑی جو ساٹھ کے لگ بھگ ہوگا کھادی کے نہایت ہی اجلے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے تلے ہوئے گردے اور جھینگے کھا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ برابر بیٹھی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کی ران پر بار بار مارتا رہتا جو چپکے چپکے مسکراتی ہوئی تھوڑی تھوڑی دیر سے چسکی لیتی رہتی تھی۔ دُور ہی سے لگتا تھا کہ وہ اس سے گندے لطیفے سُن رہی تھی۔

درمیانی میز کے گرد صوفوں پر تین نوجوان اپنی آبائی دولت کا فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے ایک ایک کمسن لڑکی پہلو میں لئے بیٹھے پی رہے تھے۔ ان کی بات چیت کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ یورپ کے پچھلے سفر کا ذکر ہو رہا تھا یا نئی شاندار اور قیمتی کاروں کی خرید و فروخت کا۔

ایک کونے میں بہت دُور بہت بڑھیا سوٹ میں ایک درمیانی عمر کا متین آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک گداز بدن بنگالی عورت تھی۔ شراب کی بوتل اور آدھے آدھے گلاس سامنے میز پر رکھے تھے۔ دونوں سگریٹ پھونک رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

ایک طرف صرف کچھ عورتیں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت بیکار اور بے روزگار تھیں شاید ہر ایک کو امید ہو گی کہ اس کا اپنا کوئی گاہک بس آتا ہی ہو گا۔ آنٹی بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ آنٹی کو میں غور سے دیکھنے ہی لگا تھا کہ ان سے نگاہیں چار ہوئیں اور وہ فوراً میری طرف آنے لگیں۔ میں اپنے جائزے اور خیالات سے چونکا، تو پتہ چلا کہ میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میرا دوست اس پنجابی عورت کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا تھا اور وہ دھان پان گجراتی لڑکی فلمی ہیرو کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"تم اکیلے کیوں بیٹھے ہو ڈارلنگ؟" آنٹی میرے سامنے کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی ۔۔۔۔ وہ" میں گھبرا سا گیا۔

"شوق نہیں کرو گے؟ اندر بہت سے ویکنٹ رومز ہیں"

"جی نہیں شکریہ۔ میں یہ شوق نہیں کرتا"

"سچ؟" یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس بیٹھ گئیں "یہاں تو جو آتا ہے جسٹ ٹو ہیو فن اینڈ گڈ ٹائم"

"جی ہاں۔ مگر میں اپنے دوست کے ساتھ یوں ہی چلا آیا تھا"

"تم ان کی فرم میں پبلک ریلیشنز آفیسر ہو؟"

"جی"

"یہ بھی تو ایک اسٹیبلشمنٹ آف پبلک ریلیشنز ہے" آنٹی نے فوراً ایسی سنجیدگی سے جوڑ ملایا کہ میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم میریڈ ہو؟" آنٹی نے پینترا بدلا۔

"جی نہیں"

"گڈ گریشس! کنوارے ہو کر ایسے خشک مزاج ہو، کمال ہے" انھوں نے بڑی حیرت ظاہر کی۔

ان کی یہ سب، ہی باتیں محض ایک اور گاہک حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ اور میں اُن کے مال بیچنے کی ماہرانہ صلاحیت کا دل ہی دل میں قائل ہوگیا۔

"امپاسبل" کچھ دیر رُک کر جیسے انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔

"بات یہ ہے آنٹی ... کہ میں اس کام کو، اس پیشے کو، اس ماحول کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا"

"واٹ" آنٹی چونکیں اور کچھ دیر تو بس مجھے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پھر اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے بولیں "آج تک میرے منہ پر ——— نوون ٹولڈ لائک دِس"

اب میرے بدحواس ہونے کی باری تھی۔ آنٹی کے گھر میں بیٹھ کر میں نے ان سے ایسی بات کہہ دی جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگی تھی۔ میں جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔

"آئی ایم سوساری" اور میں جانے لگا۔

"سِٹ ڈاؤن" آنٹی نے کچھ ایسی خود اعتمادی سے حکم دیا کہ میں ایک پٹے ہوئے شریر لڑکے کی طرح ان کی حکم عدولی نہ کر سکا اور بیٹھ گیا۔

"میں نے کچھ مائنڈ نہیں کیا۔ بلکہ مجھے تمھاری فرینکنس پر حیرت ہے۔ آئی ایڈمائر یو سو مچ، میں تو ہول لائف تم جیسے آدمی کی راہ دیکھ رہی تھی، جو آنسٹ اور ٹرتھ فل ہو۔ کوئی اپنے آپ کو کس کر چانٹا نہیں مار سکتا۔ ایسے سلیپ کے لئے دوسرے کا ہینڈ چاہیئے ..."

اور نہ جانے آنٹی کیا کہتی رہیں۔

اگر میں کوئی ریفارمر ہوتا تو آنٹی کی باتوں سے مجھے بیحد مسرت ہوئی۔ مگر اس وقت ان کی باتوں سے مجھے بیحد شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ انھوں نے مجھے ریفارمر کا رتبہ دے دیا تھا۔

بڑا عمدہ ڈنر کھلا کر میرے دوست کے ساتھ جب وہ مجھے رخصت کرنے لگیں تو مجھ سے دوسرے دن بھی آنے کا وعدہ لے لیا۔ دوسرے دن انھوں نے مجھے اکثر آتے رہنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔ اور میں اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ بہت جلد ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے، اور کچھ ہی عرصہ میں یہ نوبت آگئی کہ مجھ سے زیادہ ان کا منہ چڑھا کوئی نہ تھا۔ بغیر کسی غرض اور مطلب کے ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھے میری بے باکی اور اصول پرستی کے لئے عزیز رکھتی تھیں اور میں ان کی شفقت اور پیچیدگی کردار کے سبب ان میں دلچسپی لینے لگا۔

آنٹی کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ اس قدر ہر دلعزیز تھیں کہ عوام کے بھی ہر دلعزیز اداکار، ممثلائیں، فنکار، ادیب اور سیاسی رہنما اُن پر نچھاور ہوئے جاتے تھے۔ بمبئی کے اونچے طبقے کی کوئی تقریب، کوئی محفل اور کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا جس میں وہ مدعو اور موجود نہ ہوتیں۔ ایوز ویکلی اور آن لوکر کی کوئی اشاعت ایسی نہ ہوتی تھی جس میں وہ کسی سماجی اجتماع کی تصویر میں اپنی جھلک نہ دکھا رہی ہوں۔ کسی غیر ملکی وی۔ آئی۔ پی کے استقبال کے لئے گیٹ وے آف انڈیا یا سینٹا کروز، ایئرپورٹ پر وزراء، شیرف، غیر ملکی قونصلوں اور عمائدین شہر کے ساتھ وہ بھی دکھائی دیتیں۔ پریسٹیج فلموں کے پریمئر یا مہورت پر، برمبرن اسٹیڈیم میں کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں، بمبئی جیمخانہ کے بین الاقوامی ٹینس چمپیئن شپ کے مقابلوں میں کوپریج پر روورس کپ کے فٹ بال ٹورنامنٹ میں، بلیرڈز، اسنوکر، گاف اور پیراکی کے مقابلوں میں، ایتھلیٹکس کاؤس جی جہانگیر ہال کے نیم سیاسی جلسوں میں، مغربی موسیقی کے کنسرٹ میں، جہانگیر آرٹ گیلری میں پینٹنگ کی نمائشوں میں، رنگ بھون کے اوپن ایئر خیراتی مشاعروں میں بھارتیہ ودیا بھون کے ڈراموں، برلا ماتوشری سبھا گھر کے پروگراموں، سر سنگار سمسد کے میوزیکل فیسٹول اور مہالکشمی ریس کورس کی ہر ایک میٹنگ میں آنٹی اپنے نہایت ہی فنکارانہ ذوق کے ملبوس اور نئی نئی وضع کے بیش قیمت زیورات پہنے اپنی مخصوص تمکنت اور وقار کے ساتھ نمایاں طور پر ضرور شرکت کرتیں۔

سب ہی ان کو آنٹی پکارتے تھے۔ اجتماعی تصویروں کے نیچے اور سماجی خبروں میں ان کا

ایک نام ضرور چھپتا تھا۔ مگر وہ اصلی نہیں تھا۔ کسی کو ان کے اصلی نام اور کسی اور اصلیت کا پتہ نہ تھا۔ بہت سے بہت ایرسٹوکریسی کے لوگوں کو ان کے کاروبار کا پتہ تھا۔ اس سے زیادہ نہ وہ جاننا چاہتے تھے اور نہ جاننے کی ان کو کوئی خاص ضرورت تھی۔

آنٹی کا کاروبار ملابار ہل پر ان کی اپنی کوٹھی "زرنگار" میں ہوتا تھا۔

جب سورج تاریکیوں میں کھو جاتا تو "زرنگار" میں سویرا ہونے لگتا، آنٹی کو ان سو مینا کی شکایت تھی، اس لئے وہ دن کو ہی سوتی تھیں۔ سرِ شام ہی ملازم ڈرائنگ روم، خوابگاہوں برآمدوں، گیلریوں اور ٹیرس کی صفائی کرنے لگتے۔ آنٹی جب روز کی طرح ایک نئی عورت بن کر کمرے سے برآمد ہوتیں تو سب سے پہلے سارے گھر کا جائزہ لیتیں۔ ہر چیز بڑے قرینے سے اپنی جگہ رکھی صاف ستھری دکھائی دیتی۔ فرش، دروازے، کھڑکیاں، شیشے چمکتے دکھائی دیتے۔ جگہ جگہ رکھے ہوئے گلدانوں میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو پھول مہکتے رہتے۔ معطر خواب گاہوں میں تکیوں پر اجلے اجلے غلاف رہتے اور بستروں پر اجلی اجلی چادریں ہوتیں، جن پر تہوں سے پیدا ہونے والی شکنیں کہیں ابھری ہوئی اور کہیں دبی ہوئی لکیروں کی شکل میں لیٹی رہتیں۔ سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر آنٹی دیکھ لیتیں کہ مخصوص ضرورت کے پیکٹ اور چھوٹے تولیے ان میں رکھے ہیں۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے وہ برآمدے میں چلی آتیں۔ پورے بغیچے اور "اِن" کے گیٹ سے پورچ تک آنے والے اور پورچ سے "آؤٹ" کے گیٹ تک جانے والے راستے پر نظر دوڑاتیں۔ اگر کچھ دکھائی دے جاتا تو مالیوں کو ڈانٹتیں۔

"یو بلڈی سوائن۔ وہ دیکھو وہاں ایک پتہ پڑا ہے اٹھا جلدی سے۔"

"اِدھر دیکھو یو اسکنگ، وہاں پھول گرا پڑا ہے، پھینک اسے۔"

نئی نئی آبیاری سے اٹھنے والی پھولوں اور پتیوں کی خوشبوؤں میں ایک گہری سانس لیکر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آتیں۔ اور ریڈیو پر کہیں سے مغربی موسیقی کا پروگرام دھیمے سُروں میں لگاتیں پھر مختلف تپائیوں اور میزوں پر رکھے ہوئے طرح طرح کے ڈبوں میں سے کسی ایک سے سگریٹ نکال کے جلاتیں اور کسی ایک صوفے پر آرام سے بیٹھ جاتیں۔

اب اتنا وقت ہو جاتا کہ ستارے ایک کے بعد ایک اُترنے لگتے اور ان کی وقتی پرستش

کرنے والے ان کے گرد جمع ہونے لگتے ـــــ یہ زہرہ جبیں قوم اور مذہب سے بے نیاز ہوتی تھیں، جیسا کہ اس پیشے کا قاعدہ ہے۔ لیکن شناخت کے لئے ہر قوم اور مذہب کی ہوتی تھیں۔ اُسی طرح گاہک ہوا کرتے تھے۔

سرکاری مصروفیات سے بوکھلائے ہوئے بڑے بڑے عہدے دار، کاروباری الجھنوں سے گھبرائے ہوئے تجار، ایسے نئے اور خام دولت مند جن کو سرور کام و دہن کا بڑا شوق تھا یا ہوس پرستی کو جنھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا وہاں آجایا کرتے۔ اپنی بوتل الگ لیکر بیٹھ جاتے یا ڈرائنگ روم اور ڈائینگ رُوم کے درمیان بنے ہوئے بار سے جام لیتے جاتے اپنی اپنی نازنین کے ساتھ کچھ ٹیرس پر چلے جاتے۔ کچھ خواب گاہوں میں چلے جاتے ـــ کچھ ڈرائنگ روم یا لونگ رومز میں ہی دُور دُور بیٹھے رہتے اور ہلکی ہلکی موسیقی کے پس منظر میں سرگوشیاں یا چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ کچھ دو ڈن فلور پر ڈانس کرنے لگتے۔ آنٹی سب کی خاطر تواضع میں لگی رہتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے ہر ایک گروہ یا جوڑے کے پاس جاکر پوچھنے لگتیں۔

"ڈو یو وانٹ انی تھنگ ڈارلنگ"۔

ہر طرح کی اعلیٰ شراب کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے لوازمات اور لذیذ غذائیں بھی تیار کی جاتی تھیں اور جس کو جس وقت جہاں کھانے کی ضرورت ہوتی وہاں منگوالیتا۔

کبھی کوئی جوڑا کچھ دیر کے لئے ڈرائیو پر چلا جاتا۔ کوئی دو ایک گھنٹے گزار کر ہی اپنی گھر والی کے ڈر سے جلدی چلا جاتا۔ کوئی نصف شب کو، کوئی اس سے بھی دیر سے، کوئی صبح سویرے اور کوئی گاہک تو ناشتہ سے بھی فارغ ہو کر جاتا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جانے والا جاتے جاتے آنٹی کو سودے کے مطابق سو سو کے بہت سے نوٹ یا ہزار کے ایک دو نوٹ دے جاتا۔ اس کے بعد آنٹی اپنا بڑا سا حصّہ کاٹ کر باقی مقرّرہ رقم کمانے والی کو دے دیتیں۔ یہ ایک بندھا ہوا معمول تھا۔ تمام عورتوں اور آنٹی میں ایک طرف اور تمام گاہکوں اور آنٹی میں دوسری طرف ایک ایسی یک فہمی ہوتی تھی کہ کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آتا۔

آنٹی کا دائرۂ اثر و رسوخ جس قدر لامحدود تھا، ان کی رسد بھی اس طرح بے انتہا تھی۔

کسی دوسری تجارت کی طرح یہاں بھی نیا نیا مال آتا رہتا تھا۔ کھپت رہتا تھا اور جب ٹھکانے لگ جاتا تو اور نیا مال دستیاب کرتی تھیں۔

آنٹی کئی طریقوں سے اپنا مال دستیاب کرتی تھیں۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ متوسط طبقے میں کاروبار کرنے والے دلالوں سے ان کا ربط تھا۔ یہ دلال ایسی دوشیزاؤں کو آنٹی سے ملا دیتے تھے جو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں۔ ان میں کالج کی لڑکیاں بھی تھیں۔ دفتروں میں کام کرنے والیاں بھی اور گھریلو بیویاں بھی جو شہروں کی مرضی سے یا شوہروں کی لاعلمی میں "زر نگار" آجایا کرتی تھیں۔ خالص اور اعلانیہ پیشہ ور عورتوں کو ان کے نمایاں گھٹیا پن کی وجہ سے آنٹی نہیں لیتی تھیں۔ سوائے ایسی لڑکیوں کے جو بیحد قبول صورت یا غیر معمولی جنسی کشش رکھنے والی ہوتی تھیں۔ ایسی لڑکی کی وہ خفیہ طور پر کئی روز تک تربیت کرتیں کہ کس طرح چلنا چاہیئے۔ کس طرح اٹھنا اور بیٹھنا چاہیئے۔ مسکرانے کے انداز اور بات چیت کے طور طریقے کیا ہوں اور اس میں جو بھی خامیاں ہوتیں وہ دُور کر دیتیں۔ مثلاً دورانِ گفتگو چھت کی طرف دیکھنا، سر کھجانا، منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں سے کچھ نکالنا، ڈکار لینا وغیرہ آنٹی بڑی خوش اسلوبی سے یہ عیب نکال دیتیں۔ پھر اس کو ایسے لباس اور زیور مہیا کر دیتیں، جو دیکھنے میں بڑے قیمتی لگتے تھے۔ لیکن دراصل اتنے قیمتی نہ ہوتے تھے۔ رنگوں کے امتزاج، مختلف اوقات میں رنگوں کا استعمال اور سنگھار کے اصول اور معیار اچھی طرح سمجھا دیتیں اور ان چیزوں کا ذوق اس میں "کاشت" کرتیں جب آنٹی کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی گاہک کو اس مال سے کوئی شکایت ہی پیدا نہیں ہو سکتی تب وہ اس کی نمائش کرتیں اور بڑے دل لبھانے والے انداز میں اس کو پیش کرتیں اور مال یکایک چل پڑتا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی جو اونچے طبقے کے کئی گھرانوں اور خاندانوں میں رسوخ رکھتی تھیں، اسکینڈلز پر ہمیشہ کان لگائے رہتی تھیں، جہاں انھیں پتہ چلا کہ کسی بیوی کی اپنے شوہر سے ان بن رہتی ہے یا کسی نے علیحدگی اختیار کر لی ہے یا طلاق لے لی ہے تو اس کو بڑی ترکیب سے اپنے دام میں لے آتیں پھر شوروم میں منتقل کر دیتیں، جہاں اس نئی درآمد کو خوش آمدید

کہا جاتا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی سماجی محفلوں اور تقریبوں میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھتیں جو ان کے نزدیک اس پیشے میں بڑا خوش گوار مستقبل رکھتی تھیں۔ آنٹی کی یہ ٹوہ پہلے تو ان کی عادت بن گئی پھر جبلّت، جو غیر شادی شدہ عورت یا نوخیز بلا ان کو بڑی ایڈوانس، فیشن زدہ، سوشل حلقوں میں گھل مل جانے کی دلدادہ، بے تکلّف، بے حجاب شوقین اور رنگین مزاج نظر آتی وہ اس پر ذہنی طور سے نشان لگا دیتیں۔ فوراً اس کی گرویدہ ہو جاتیں۔ بڑی جلدی اسے بھی اپنا گرویدہ کر لیتیں اور اس کے بہت سے گرویدہ ہونے والے اسے مہیّا کر دیتیں۔

چوتھا طریقہ یہ تھا کہ امریکہ، یورپی ممالک اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ ہانگ کانگ، ٹوکیو اور سنگاپور کے اعلیٰ معیاری قحبہ خانوں اور پیشہ ور عورتوں کے تاجروں سے ان کا ربط تھا، وہ اپنے اور ان کے ذخیروں کے نوادرات کا تبادلہ کیا کرتی تھیں۔ وساور سے آئے ہوئے بیش بہا نمونوں کو وہ تاج، ایمبیسڈر، سن این سینڈ، نٹ راج اور رٹز سے کم درجے کے ہوٹلوں میں نہ رکھتی تھیں اور ان کے فرضی خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی تشہیر کر کے اونچے شوقین حلقوں میں ان کے لئے طلب پیدا کرتی تھیں۔

یہ چار عام اور مستقل طریقے تھے۔ ان کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی آنٹی مال حاصل کرتی تھیں یا مال ان تک پہنچ جاتا تھا۔ حسن و جمال کے یہ نوادرات خرچ کرنے والوں کی حیثیت کے مطابق ہمیشہ دستیاب ہو سکتے تھے۔

"زرنگار" محض اعلیٰ پیمانے کی ہوس کاری کا مرکز ہی نہیں تھا، جہاں کتنی ہی کنواریوں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کیا تھا اور کئی دوسری عورتوں نے دُنیا کا سب سے پُرانا اور آسان پیشہ شروع کیا تھا، بلکہ بڑے بڑے تاجروں اور سرکاری عہدیداروں کی کارگزاریوں کی ابتدا اور انتہا بھی یہاں ہوا کرتی تھی اور آنٹی کو کمیشن کے طور پر بڑی بڑی رقمیں اور تحفے تحائف ملا کرتے۔

سرکاری اور غیر سرکاری ٹھیکے، درآمد و برآمد کے اجازت نامے، بڑی بڑی رُکی ہوئی کارروائیوں کی تجدید، یا رواں دواں کارروائیوں کی رکاوٹ، عظیم و فلک بوس عمارتوں،

بے نظیر تھیٹروں ، نئی ملوں اور فیکٹریوں کے قیام کے منصوبے یہاں بنتے تھے اور مشکلوں میں گرفتار بڑے بڑے سرمایہ داروں کی نجات کا یہاں انتظام ہوا کرتا تھا۔ بعض دفعہ سیاسی اور صنعتی پالیسی غیر سرکاری طور پر یہاں طے پاتی تھی جو بعد میں سرکاری نوعیت اختیار کر لیتی تھی، ایک دفعہ تو ایک سیاسی جماعت کے مینی فسٹو کا خاکہ یہاں تیار کیا گیا تھا۔

"آنٹی کا مقولہ تھا، دُنیا کا کوئی کام امپاسبل نہیں، عورت اور شراب سپلائی کر کے دیکھ لو"۔ عورت اور شراب سپلائی کر کے انھوں نے نہ صرف دوسروں کے کام بنوائے تھے، بلکہ اپنے کام بھی نکالے تھے۔ ان عورتوں کا کام بھی بن گیا تھا جو سپلائی کی گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔

آنٹی کی خدمات بڑی مخلصانہ، باذوق، انتہائی آرام دہ، بے خطر، اور اپنی تجارت میں اتنے اُونچے معیار کی تھیں کہ کوئی ان سے مسابقت ہی نہ کر سکتا تھا اور اس اجارہ داری میں ان کا کاروبار چمک چمک اٹھا۔

آنٹی سے میرا ملنا جلنا بہت بڑھ چکا تھا۔ آنٹی کی شفقت اور نوازشیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اگر کسی وجہ سے چار پانچ روز تک ملنا نہ ہوتا تو ہم بے چین ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈھ نکالتے۔ اپنے مسائل، اپنا دُکھ درد ایک دوسرے کو سناتے، مشورے لیتے اور دیتے، دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ میں ان کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا اور وہ بھی شاید مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، جبھی تو ایک روز اچانک پوچھ بیٹھیں۔

"یہ بتاؤ ڈارلنگ! تم کو میرا آکیوپیشن پسند نہیں۔ تم کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں، دن وائی ڈو یو لائک ٹو کم ہیر اینڈ سی می؟"

"آپ میرے لئے بہت اچھی ہیں۔ بس یہی میرے لئے بہت کافی ہے"۔ میں نے بیساختہ جواب دیا۔

"یو آر ٹو آنسٹ"۔ آنٹی جذباتی ہونے لگیں۔ "آئی لائک یو ویری مچ۔ آئی لو یو ڈیمر۔ جی چاہتا ہے تم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ تمھاری ایک ایک چیز کی کیئر کروں۔ تم کو ہر ایک کمفرٹ پہنچاؤں۔ میں تم سے اتنی کلوز ہو گئی ہوں کہ کسی اور سے نہیں۔ آئی ڈونٹ نو وائی؟ یا شاید

بی کازسم ٹائم آئی بیلیو دیٹ یو آر مائی سن"۔

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ کہیں کھوگئیں۔ میں چپ چاپ وہسکی کے گھونٹ اتارتا رہا۔ بڑی دیر تک ہم یونہی بیٹھے رہے۔ یکایک آنٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ڈیم می" رو رو کر کہتی جاتی تھیں "آئی ایم اے سوائن ڈارلنگ۔ آئی ایم اے بچ۔ آئی ایم اے ہور۔ آئی ایم رچڈ۔ ڈارلنگ میں بہت بُری عورت ہوں"۔

آنٹی جو ہر وقت مسکراہٹوں اور مسرتوں سے لدی رہتی تھیں اور ہمیشہ مسکراہٹوں اور مسرتوں کی ہی تجارت کرتی تھیں۔ وہ آنسوؤں کی چوری چوری ساخت بھی کرتی تھیں۔ میں انھیں ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اب تک کوئی بے گناہ تھیں۔ اور حیرت زدہ طور پر انھوں نے اچانک ایک اعترافِ جرم کیا ہے جس پر مجھے یقین نہیں آتا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آنسوؤں سے آپ کا کیا واسطہ۔ لیکن پوچھا نہ گیا۔ اس قدر خوش حال اور خوش مزاج عورت کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا کہ اسے بھی کوئی دُکھ ہوگا۔ اس کی رُوح بھی مجروح ہوگی۔ بالظاہر ہم جن کو دائمی طور پر مسرور سمجھتے ہیں وہ بھی دائمی طور پر مغموم ہی ہوتے ہیں۔ ان کا ملمع ہم کو ان کی اصلی تہہ تک پہنچنے ہی نہیں دیتا مگر اس ملمع کا چھلکا ایک دفعہ یوں نکل آتا ہے جیسے پیراکی کے پیرہن میں نیم عریاں تنومند عورت کو دیکھ کر نظر اس کا برائے نام لباس فوراً اتار دیتی ہے۔

انہی "سوائن" اور "رچڈ" آنٹی نے مجھے ایک روز ٹیلیفون کیا۔ اس سال بمبئی میں بڑے زور کی برسات ہو رہی تھی اور ایک تسلسل ایسا بھی تھا کہ کئی روز سے بمبئی مفلوج پڑی تھی اور زندگی معطل سی، کتابیں اور رسالے پڑھ پڑھ کر، ریڈیو سُن سُن کر اور خوب سو سو کر میں بُری طرح اکتا گیا تھا۔ بس ایسے ہی موقعوں پر کنوارپن سے سخت نفرت ہونے لگتی ہے اور کسی سے بھی شادی کرنے کو جی تڑپنے لگتا ہے۔ ایک دُھواں دھار اور تنہائی گزیدہ شام کو چائے پیتے ہوئے میں مختلف لڑکیوں کو تصوّر ہی تصوّر میں شادی کی پیش کش کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ڈارلنگ ـــ کسی طرح چلے آؤ ـــ امیڈیٹلی ـــ ارجنٹ کام ہے"۔

"آنٹی آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر راستے میں پانی بھرا پڑا ہے۔ تین چار روز سے کار یوں ہی کھڑی ہے۔ پتہ نہیں بیٹری کام بھی کر رہی ہے یا نہیں۔"

"میں اپنی کار بھیج دیتی ہوں۔"

جب آنٹی کے ہاں پہنچا تو ایک لڑکی ان کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے ایک نظر دیکھ کر اتنی بڑی بڑی پلکوں کے غلاف اس نے اپنی غزالی آنکھوں پر ڈال دیئے۔

"ڈارلنگ، ان سے ملو، پاربتی مصرا۔" پھر آنٹی نے اس کو میرا نام بتایا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پھر جواب میں نمستے کی۔

"ڈارلنگ! تم ان سے شادی کر لو۔"

بادل بڑے زور سے گرجے اور بجلی کوند گئی۔

"میں کل ہی رجسٹرار کو انفارم کر دوں گی۔" آنٹی مسلسل برس رہی تھیں۔

"پہلے میں ماں باپ کو خط لکھ کر اجازت تو لے لوں۔" میں نے مورچہ سنبھالا۔ "آخر وہ بھی تو شریک ہوں گے شادی میں۔"

"ڈیم اِٹ۔ یہ ہندوستانی ماں باپ بھی پکیولر چیز ہیں۔ میبرج ہوگی اولاد کی اور سلیکشن ہوگی اُن کی۔ میں کہتی ہوں ڈارلنگ تم اپنی مرضی کی شادی میری سلیکشن سے کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں اور پاربتی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بات یہ ہے آنٹی کہ آپ میرے گھر کی پکیولر حالت اور مجبوریاں نہیں جانتیں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔" آنٹی نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اس لیڈی سے شادی کر لو۔ شی از سو سویٹ اینڈ چارمنگ اینڈ کیوٹ۔" وہ پاربتی کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ان ہی کی اپنی تخلیق تھی۔ "پور پاربتی۔" پھر میری طرف رُخ کیا۔ "بے چاری بڑی بدنصیب ہے۔ یو وِل سمپلی کرائی اَیٹ ہر مس فارچون، بڑی اچھی فیملی کی ہے۔ گریجویٹ ہے۔ کلچرڈ ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ سے الوپ کر کے آگئی۔ اور یہاں آ کے اس باسٹرڈ نے اسے بی ٹرے کر دیا۔ کہنے لگا شادی کی بس ایک کنڈیشن ہے کہ فلموں میں کام کرو، پور پاربتی کو ایگری کرنا پڑا۔ پھنس جو گئی تھی۔ پھر کیا ہُوا یو نو؟ آل دوز ڈرٹی پروڈیوسرز اور اسٹنٹنگ ڈائرکٹرز

فلرٹیڈ وِتھ ہر۔ پھر وہ بھی دغا دے گئے۔ کوئی کہنے لگا چن نکیلی ہے۔ کوئی بولا وائس مردانہ ہے۔ کسی کی اوپی نین تھی کہ ان فوٹو جنک ہے۔ اینڈ سو آن۔ اینڈ سو فورتھ۔ اور پتہ ہے اس کے سن آف اے گن بوائے فرینڈ نے کیا کہا؟" یہاں تک آتے آتے آنٹی کے لہجے میں غضب ناک اُتار چڑھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں وہ ایک ثانیے کے لئے رُکیں۔ میری نظر فطری طور پر پاربتی پر گئی۔ اور اسی وقت اس کی نظر جو مجھ پر تھی جھک گئی۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ زرد ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کو ہراسانی سے بچانے کی خاطر آنٹی کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں "ہی آسکڈ ہر ٹو ڈو پروسٹی ٹیوشن"۔ آنٹی کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اس سکوت کی چٹان تلے تین ذہنوں کی ہل چل تھی۔

"ویٹ از وائی شی از ہیئر۔ لیکن یہ بچاری اس پروفیشن سے سخت نفرت کرتی ہے تمھاری طرح۔ اینڈ شی ٹولڈ می کہ کوئی بھی شریف آدمی اس سے شادی کرلے تو شی از ریڈی۔ مَیں نے سوچا تم سے اچھا پاربتی کو کون ہسبینڈ مل سکتا ہے۔ ڈارلنگ پلیز تھنک اوور اٹ"۔

میری فکر و فہم خلاؤں سے بھرپور ہو گئی۔ اس طرح مجھے خاموش دیکھ کر آنٹی کو حیرت سی ہو رہی تھی۔ انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ میں اُن کے حکم سے انکار نہیں کروں گا۔ پاربتی معمولی طور پر مایوس دکھائی دیتی تھی گویا اسے یقین تھا کہ میں اس پیش کش کو قبول نہ کروں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ؟" آنٹی نے پوچھنے کے انداز میں جیسے کہہ دیا کہ آخر اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے۔ ہاں کر دو نا۔ اس سے اچھی لڑکی پھر نہ ملے گی۔

لڑکی بہت اچھی تھی، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن دراصل میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ میرے آمد و خرچ کے مواز نے میں اور ذمّہ داریوں کی فہرست میں ابھی اس کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ دوسرے اس لئے کہ جس ڈھب سے میری زندگی گذر رہی تھی، میں اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ایسے ماضی رکھنے والی لڑکی کو میں بیوی بنانے کے لئے ہرگز تیّار نہ تھا۔

"آئی ایم سوساری آنٹی۔ آئی کانٹ۔"

آنٹی کو بڑی سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے پاربتی کو دیکھا اور

اندر چلی گئیں۔ پاربتی کے آنسو نکل پڑے۔ مجھے بڑا فسوس ہوا مگر میں مجبور تھا۔ کچھ دیر بعد آنٹی ایک سفید لفافہ لئے آگئیں اور پاربتی کے حوالے کرتی ہوتی بولیں۔

"تمھارا ایک ویک کا خرچ"

"نو تھینکس آنٹی" پاربتی نے بڑی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

آنٹی نے بہت اصرار کیا لیکن اس کے انکار کو اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی۔

"ڈونٹ گیواپ ہوپ" جب وہ جانے لگی تو آنٹی نے اس سے کہا۔ "مجھ سے ملتی رہنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا"

"پروسٹی ٹیوشن کے لئے میرے پاس سینکڑوں لڑکیاں آئیں"۔ اس کے جانے کے بعد آنٹی مجھ سے بولیں "او نلی دِس وَن۔ اس کے لئے آکر بھی یہ نہیں کرنا چاہتی۔ سو اسٹرینج"

دوسرے دن شام کو آنٹی نے پھر فون کیا۔

"ہلو ڈارلنگ، یونو؟ پاربتی نے سوسائیڈ کرلی۔ ایوننگ نیوز میں خبر آئی ہے۔ آئی ڈونٹ نو کیسے لوگ اتنے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ مرنے کو کیسے تیار ہوجاتے ہیں۔ جسٹ امیجن! وہ پاربتی جس کے ساتھ کل شام کو تم میرے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے آج خود اپنی جان لے لی۔ کانٹ بلیو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا مسٹری ہے۔ سفرنگ اور ڈیتھ کیوں ہوتی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ ڈارلنگ اگر دُنیا سے یہ ختم ہوجائیں تو دُنیا کتنی بیوٹی فُل اور کلرفُل بن جائے۔ کیا خیال ہے تمھارا؟"

"آنٹی ہر ایک کی زندگی اور موت اس کا تجربہ ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہو ہی نہیں سکتا"

"پاربتی کی جگہ میں ہوتی تو کبھی سوسائیڈ نہیں کرتی" آنٹی نے میری بات کاٹی اور فون رکھ دیا۔

قہقہوں کے ایک شور سے میں چونکا، مہمانوں کا آخری گروہ رخصت ہو رہا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ آنٹی اور ان کے ماضی کے بارے میں سوچتے سوچتے میں ذہنی طور پر ایسا گم ہو گیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کب ان کی سالگرہ کی دعوت ختم ہوئی۔ آنٹی میرے پاس آئیں۔

"کم ان مائی روم ڈارلنگ"

ہم دونوں ان کے کمرے میں پہنچے۔ مجھے انھوں نے ایک صوفے پر بیٹھا دیا اور خود میرے سامنے کھڑی ہوگئیں مسکراتے ہوئے۔ بڑے پیار سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیر تک دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے جو جذبات جھلک رہے تھے، میں ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو گویا میری گمشدہ ماں محسوس کر رہی تھیں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آنٹی جو کبھی کبھی پچاس سے زیادہ کی زندگی پر خوف زدہ ہو جاتی تھیں اب پچاس ہزار برس جینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹیں گی۔

" ایٹ پریذیڈنٹ تم ایک ہی آدمی ہو جسے میں اپنا سمجھتی ہوں۔ بائی ناؤ تم میرے بارے میں کافی جانتے ہو لیکن بہت زیادہ نہیں"

" آنٹی اگر آپ اپنے بچپن اور جوانی کے بارے میں ۔ ۔ ۔ "

" رائٹروں کی ذات بڑی ان کوئی زیٹو ہوتی ہے" آنٹی نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے پتہ تھا تم ایک نہ ایک روز ضرور پوچھو گے۔ خیر تمھاری کیوریاسٹی کے لئے میں بہت ہی شارٹ کر کے بتاؤں گی۔ بی کاز یو آر ویری ڈیر ٹو می۔ آئی ایم پراؤڈ ٹو ہیو این ان سلفش فرینڈ لائک یو۔"

"تھینک یو آنٹی"۔ میں نے اپنی تعریف سے خوش ہو کر کہا۔

" ویلکم۔ یہ اور بات ہے کہ تمھارے اور میرے آئیڈیاز کبھی نہیں ملے۔ بٹ آئی ڈونٹ کیئر" آنٹی نے دو پیگ بنائے۔ ایک میرے سامنے رکھا۔ ایک سگریٹ مجھے دیا اور ایک خود جلایا۔ گہرے کش کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگیں "کسی اور کو میرا پاسٹ کچھ معلوم نہیں۔ میں گلبرگہ ڈسٹرکٹ کے ایک فار آف ویلیج میں آج سے پورے ففٹی ایرز بیک پیدا ہوئی تھی۔ آئی واز بارن اے مسلم۔ آفٹر برتھ میرے کانوں میں اذان دی گئی اور اذان دینا میرے فادر کا آکیوپیشن تھا۔ میں بڑی منتوں، مرادوں اور آل سارٹس آف نان سنس کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اسی روز شام کو مائی مدر ڈائیڈ۔ دین آئی واز برائٹ اپ بائی اے اسٹیپ مدر۔ جب سے ہوش سنبھالا ظلم اور ٹارچر ہی کی گود میں اپنے آپ کو پایا۔ چار پانچ سال کی تھی فادر آل سو پاسڈ اوے۔ پھر ایک جاگیردار نے مجھے خرید لیا۔ وہاں بھی دن رات بیٹنگ ملتی تھی۔

دیٹ بلڈی جاگیر دار، ہز وائف، چلڈرن اور سرونٹس چلتے پھرتے جس کا جی چاہتا ہاتھ صاف کرتا رہتا۔ سڑے ہوئے کھانے، ڈرٹی کلوتھز۔ پتہ نہیں میں کیسے جی گئی اور کیوں جی گئی۔ او ہو۔ ڈیم ہی۔ میں بیکارڈی ٹیلس میں جا رہی ہوں۔"

"ایسے ہی سنائیے آنٹی" میں نے مچل کر کہا۔

"نو نو نیور" آنٹی نے اسکاچ کا گھونٹ کیا۔ "مخواہ مخواہ آئی ایم گٹنگ اموشنل فار دیٹ ہارڈ پاسٹ، فل آف سفرنگ۔ جب میں جوان ہوئی تو میری میچ لیس بیوٹی میرے لئے بلا بن گئی۔ اس کے لئے میں نے بہت دکھ جھیلے۔ بڑی سخت اور منحوس بیماریوں سے بچ نکلی۔ کسی کے ساتھ بھاگ گئی، کسی کی وائف بنی، محبّت بھی کی، رومانس بھی کیا، پروسٹی ٹیوشن بھی کیا۔ گندے سے گندے اور گھٹیا سے گھٹیا مردوں کے پاس رہی جن میں اسمگلرز، پک پاکٹس، موالیز اور پمپس بھی تھے۔ اچھے سے اچھے مردوں کے ساتھ بھی رہی جن میں جغادری انٹلکچولز، آرٹسٹ، ٹیکنوسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی۔ عیاشی کے ایک سے ایک۔ بڑھ کر خلیفہ کو انٹرٹین کیا۔ بہت رچ مل اونرز گورنمنٹ آفیسرز اور نہ جانے کس کس کے بستر گرم کئے۔ سولہ پیٹ گرائے۔ دو دفعہ ومب میں ٹیومر ہوا، آپریشن کروائے۔ اس بار اگر ہو گا تو کینسر ہی ہو گا۔"

وسکی کا ایک اور گھونٹ، سگریٹ کا ایک اور کش لے کر آنٹی نے سلسلۂ بیان جاری رکھا۔

"وَن فائن مارننگ اٹے ڈ انڈ ا پان می کہ دُنیا والوں سے جوتے کھا کر جینے سے بچ بیٹر ہے کہ دُنیا کو جوتے مار کے جیا جائے۔ دن آئی مٹ وتھ تھرٹی منڈس سکس، میری لائف جو ایک ویران ڈزرٹ تھی، میں نے اس میں ایک نہایت ہی پُر فریب اور خوبصورت سراب کری ایٹ کیا، اور یہ باسٹرڈ مرد دوڑ پڑے۔ ناؤ آئی ہیو گاٹ اوری تھنگ، لاٹ آف مانیٹری سکیورٹی اینڈ سوشل اسٹیٹس۔"

پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"بس ایک ڈر ہے۔ اگر سب کچھ چھن گیا تو کیا ہو گا۔ اس عمر میں کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے۔ یہ سفرنگ کس طرح ہو گی۔ اسی لئے تو میں لنگرنگ لائف اسٹرگل فار اگزسٹنس اور ڈی لیڈ ڈیتھ سے ڈرتی ہوں۔

"مگر یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں آنٹی۔"

"یو آر ٹو فیٹلسٹ۔ پھر وہی ڈفرنس آف اوپی نین کی بات آگئی۔"

"تو پھر بتائیے سفرنگ اور ڈی لیسڈ ڈیتھ کا خود آپ کے خیال میں کیا علاج ہے۔"

آنٹی نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور طنز سے مسکرائیں جیسے وہ کوئی بہت ہی پختہ کار تھیں اور میں ان کے مقابلے میں بڑا ہی نادان تھا۔

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ زہر کا علاج زہر سے ہی ہو سکتا ہے۔" آنٹی نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

ان کے اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

"اوکے۔ گڈ نائٹ مائی بوائے۔" آنٹی کھڑی ہونے لگیں۔

"مگر آنٹی....."

"آئی ایم ٹوٹائرڈ ناؤ۔ سلیپنگ پلز کھا کر سو رہوں گی۔"

میں جانے کے لئے اٹھا اور اُن سے ہاتھ ملایا۔

"گڈ بائی۔" اور آنٹی نے میرے گال چومے۔

راستہ بھر میں ان کی نامکمل اور غیر تشفی بخش گفتگو سے جھنجھلاتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لباس تبدیل کر کے اور روشنی بجھا کر بڑی دیر تک بستر پر پڑے پڑے سوچتا رہا۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

صبح کوئی نو بجے ٹیلیفون نے شور مچا کر مجھے جگایا۔

خبر ملی کہ آنٹی نے رات کو بہت سی خواب آور گولیاں کھالی تھیں۔

●●

رُوح کا جُگنو

میرے پلنگ کے سرہانے دیوار میں ایک کھڑکی ہے۔ اس سے میں جب بھی باہر دیکھتا ہوں تو کمپاؤنڈ سے متصل چرچ اور اس کے عقب کا قبرستان دکھائی دیتا ہے۔

دن کو تو اپنے کمرے میں مجھے رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ چھٹیوں میں دن کبھی کسی دوست کے گھر اور کبھی کسی گرل فرینڈ کے ہاں گزرتا ہے باقی دنوں میں دفتر میں سر کھپانا پڑتا ہے اور شام آفس کے دوستوں کے ساتھ پینے پلانے میں گذرتی ہے۔ رات دیر گئے اپنے کمرے میں پہنچتا ہوں اور کمرے میں داخل ہوتے، ہی اسی چرچ اور اس کے قبرستان پر نظر جاتی ہے۔

موت کا خوف انسان کو دو موقعوں پر بہت شدید ہوتا ہے۔ ایک تو جب وہ کسی جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے جب وہ کسی جنازے کے ساتھ قبرستان جاتا ہے۔ لیکن میں دو تین مرتبہ اس قبرستان کو ضرور دیکھتا ہوں اور مجھے موت کا خوف کبھی نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس قدر صاف ستھرا قبرستان ہے کہ قبروں کی چمکتی ہوئی مرمریں سلیں، اور اُن پر نصب کتبوں کے ساتھ لگی ہوئی پُر نور صلیبیں اور کہیں کہیں مقدّس مریم یا مائلِ پرواز معصوم فرشتوں کے مسکراتے بُت دیکھ کر تو موت کی خواہش ہونے لگتی ہے۔

جب کبھی رات کو پیاس سے میری آنکھ کھُلتی ہے تو پانی پی کر میں فوراً نہیں سو جاتا۔ ایک سگریٹ جلا کر، اس کھڑکی میں اپنی کہنیاں ٹِکا کر قبرستان کا نظارہ کرنے لگتا ہوں اور سگریٹ ختم کر کے پھر اپنے پلنگ پر جا لیٹتا ہوں۔

کرسمس کے دن میں صبح تین بجے کے قریب لوٹتا ہوں۔ کپڑے بدلتا ہوں اور بتّی

بجھا دیتا ہوں۔ سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی ہے اس لئے سونے سے پہلے آخری سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اور ہاتھ میں ماچس تھامے میں کھڑکی میں آتا ہوں۔ ڈانس کر کر کے بہت تھک گیا ہوں اور اپنے ایک دوست کی جو شہر سے باہر دورے پر گیا ہوا ہے، بیوی سے فلرٹ کر کے آیا ہوں۔ اور تصوّر میں ابھی تک اس کے مزے لوٹ رہا ہوں۔

سگریٹ سلگا کر میں دیا سلائی اپنے پھیپھڑوں سے نکلتے دھوئیں سے پھونک دیتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ سامنے ایک قبر کے کتبے پر بھی ایک دیا سلائی جلتی ہے اور اپنے دوسرے سرے تک جل کر بجھ جاتی ہے۔ کوئی جلانے والا دکھائی نہیں دیتا۔

بھوت پریت کا قائل نہ ہوتے ہوئے بھی میں چوکنّا ہو جاتا ہوں۔ سارے بدن میں سنسنی جھلملا اُٹھتی ہے اور پلکیں جھپکائے بغیر میں قبرستان کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔

چند لمحے گذرتے ہیں کہ اس سے متصل قبر کے کتبے پر دیا سلائی جلتی ہے اور اس طرح اُوپر سے نیچے حرکت کرنے لگتی ہے، جیسے کوئی کتبے پر کندہ تحریر پڑھ رہا ہو۔ پھر اس کے مقابل والی قبر کے کتبے پر دیا سلائی جلتی ہے اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ چند لمحوں بعد پھر اس سے اگلی قبر پر... پھر اس سے متصل... پھر اس کے مقابل... دورویہ قبروں پر چند لمحوں کے وقفے سے یہ عمل یونہی جاری رہتا۔

میں دوڑتا ہوا گھر سے نکل کر سڑک پر آجاتا ہوں۔ اور چرچ کے جالی دار فولادی گیٹ کو جو بند ہے پھلانگ کر اور اس کے باغ سے گذر کر فوراً قبرستان میں آجاتا ہوں۔

دُور ایک قبر پر دیا سلائی جل رہی ہے۔

میں چرچ کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ اور باڑھ کی آڑ میں دبے قدموں جلدی جلدی آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ اور اس اندازے کے مطابق کہ دیا سلائی اپنے تواتر میں اب کہاں جلنے والی ہے۔ اس کی سیدھ میں پہنچ کر رُک جاتا ہوں اور غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ باڑھ میں سے میں قبروں کو اور قبروں کے درمیان بنی روشوں کو آسانی سے دیکھ رہا ہوں۔

یہاں دُور سے سڑک کے لمپ پوسٹ کی روشنی بھی کچھ کچھ پڑ رہی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، بہت غور سے دیکھتا ہوں۔

رُوح کا جُگنو

میرے پلنگ کے سرہانے دیوار میں ایک کھڑکی ہے۔ اس سے میں جب بھی باہر دیکھتا ہوں تو کمپاؤنڈ سے متصل چرچ اور اس کے عقب کا قبرستان دکھائی دیتا ہے۔

دن کو تو اپنے کمرے میں مجھے رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ چھٹیوں میں دن کبھی کسی دوست کے گھر اور کبھی کسی گرل فرینڈ کے ہاں گزرتا ہے باقی دنوں میں دفتر میں سر کھپانا پڑتا ہے اور شام آفس کے دوستوں کے ساتھ پینے پلانے میں گذرتی ہے۔ رات دیر گئے اپنے کمرے میں پہنچتا ہوں اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اسی چرچ اور اس کے قبرستان پر نظر جاتی ہے۔

موت کا خوف انسان کو دو موقعوں پر بہت شدید ہوتا ہے۔ ایک تو جب وہ کسی جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے جب وہ کسی جنازے کے ساتھ قبرستان جاتا ہے۔ لیکن میں دو تین مرتبہ اس قبرستان کو ضرور دیکھتا ہوں اور مجھے موت کا خوف کبھی نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس قدر صاف ستھرا قبرستان ہے کہ قبروں کی چمکتی ہوئی مرمریں سلیں، اور اُن پر نصب کتبوں کے ساتھ لگی ہوئی پُر نور صلیبیں اور کہیں کہیں مقدّس مریم یا مائلِ پرواز معصوم فرشتوں کے مسکراتے بُت دیکھ کر تو موت کی خواہش ہونے لگتی ہے۔

جب کبھی رات کو پیاس سے میری آنکھ کھُلتی ہے تو پانی پی کر میں فوراً نہیں سو جاتا۔ ایک سگریٹ جلا کر، اس کھڑکی میں اپنی کہنیاں ٹکا کر قبرستان کا نظارہ کرنے لگتا ہوں اور سگریٹ ختم کر کے پھر اپنے پلنگ پر جا لیٹتا ہوں۔

کرسمس کے دن میں صبح تین بجے کے قریب لوٹتا ہوں۔ کپڑے بدلتا ہوں اور بتّی

بجھا دیتا ہوں۔ سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی ہے اس لئے سونے سے پہلے آخری سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اور ہاتھ میں ماچس تھامے میں کھڑکی میں آتا ہوں۔ ڈانس کر کر کے بہت تھک گیا ہوں اور اپنے ایک دوست کی جو شہر سے باہر دورے پر گیا ہوا ہے، بیوی سے فلرٹ کر کے آیا ہوں۔ اور تصوّر میں ابھی تک اس کے مزے لوٹ رہا ہوں۔

سگریٹ سلگا کر میں دیا سلائی اپنے پھیپھڑوں سے نکلتے دھوئیں سے پھونک دیتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ سامنے ایک قبر کے کتبے پر بھی ایک دیا سلائی جلتی ہے اور اپنے دوسرے سرے تک جل کر بجھ جاتی ہے۔ کوئی جلانے والا دکھائی نہیں دیتا۔

بھوت پریت کا قائل نہ ہوتے ہوئے بھی میں چوکنا ہو جاتا ہوں۔ سارے بدن میں سنسنی جھلملا اُٹھتی ہے اور پلکیں جھپکائے بغیر میں قبرستان کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔

چند لمحے گذرتے ہیں کہ اس سے متصل قبر کے کتبے پر دیا سلائی جلتی ہے اور اس طرح اُوپر سے نیچے حرکت کرنے لگتی ہے، جیسے کوئی کتبے پر کندہ تحریر پڑھ رہا ہو۔ پھر اس کے مقابل والی قبر کے کتبے پر دیا سلائی جلتی ہے اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ چند لمحوں بعد پھر اس سے اگلی قبر پر... پھر اس سے متصل... پھر اس کے مقابل... دور ویہ قبروں پر چند لمحوں کے وقفے سے یہ عمل یونہی جاری رہتا۔

میں دوڑتا ہوا گھر سے نکل کر سڑک پر آجاتا ہوں۔ اور چرچ کے جالی دار فولادی گیٹ کو جو بند ہے پھلانگ کر اور اس کے باغ سے گذر کر فوراً قبرستان میں آجاتا ہوں۔

دُور ایک قبر پر دیا سلائی جل رہی ہے۔

میں چرچ کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ اور باڑھ کی آڑ میں دبے قدموں جلدی جلدی آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ اور اس اندازے کے مطابق کہ دیا سلائی اپنے تواتر میں اب کہاں جلنے والی ہے۔ اس کی سیدھ میں پہنچ کر رُک جاتا ہوں اور غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ باڑھ میں سے میں قبروں کو اور قبروں کے درمیان بنی روشوں کو آسانی سے دیکھ رہا ہوں۔

یہاں دُور سے سڑک کے لمپ پوسٹ کی روشنی بھی کچھ کچھ پڑ رہی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، بہت غور سے دیکھتا ہوں۔

وہاں کوئی نہیں ہے۔ لیکن ایک دیا سلائی اپنے آپ جل کر کتبے پر پتنگے کی طرح حرکت کر رہی ہے۔
کہیں سے ایک بھاری آواز آتی ہے۔

"آؤ... باہر آجاؤ... میں تمھاری ہی قبر ڈھونڈھ رہا ہوں۔"

دسمبر کی سردی کے باوجود میں پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ یکایک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری کلائی کسی کی آہنی گرفت میں ہے اور میں کشاں کشاں باڑھ کے پیچھے سے نکالا جاتا ہوں اور قبرستان کے بیچوں بیچ لاکر کھڑا کر دیا جاتا ہوں اور وہی آواز کہتی ہے۔

"میرے مصلوب بیٹے۔ تیرا مقدّس باپ تیری قبر کہاں کہاں ڈھونڈ آیا اور کب سے ڈھونڈ رہا ہے۔ میرے بچے آج ہی تو تُو پیدا ہوا ہے..."

اور وہ آواز مجھے اپنے گلے سے لگا لیتی ہے۔

●●

کاغذ کی دیوار

پسِ منظر میں ایک بہت بڑی مل کی لہریالی چھت اور اس کے ساتھ لگی ہوئی اُونچی چمنی کا خاکہ دکھائی دے رہا ہے۔

پیش منظر میں ایک لمبی دیوار ہے جس کے پورے سر میں ٹوٹی ہوئی کانچ کے ان گنت ٹکڑے مستقل طور پر چبھے ہوئے ہیں۔ باہر کی طرف نکلے ہوئے کنگورے پر دُور دُور تک کچھ جگہ چھوڑ چھوڑ کر انگریزی میں لکھا ہے Stick no bills پوسٹر مت لگاؤ۔

پھر بھی اس دیوار کا سارا بدن پوسٹروں سے خارش زدہ ہو رہا ہے۔ یہ پوسٹر الگ الگ زبانوں اور رنگوں میں ہیں۔ پتہ نہیں اس پر کب سے اور کتنے پوسٹر اب تک لگائے گئے ہوں گے۔ ان کی تہوں کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

بظاہر اس کی تصویر کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک طرف سے دوسری طرف نظر ڈالنے پر سب سے پہلے ایک پوسٹر فلم "تلاش" کا ہے۔ لیکن ذرا سی دھجی اڑنے کے سبب صرف "لاش" پڑھا جا سکتا ہے اور اس پر ایک رقاصہ کا نچلا برہنہ بدن نمایاں ہے جس کے زیرِ ناف (ج) شکل کے بلبوس میں ٹھیک بیچوں بیچ کسی نے بیضوی خلا کھرچ دی ہے۔ اور اس کی بغل میں ایک اشتہار ہے جس کی جلی الفاظ کی سُرخی ہے۔ "زندگی سے مایوس نوجوانوں کو مژدہ" اس کے ساتھ ہی فوج میں بھرتی کی دعوت والا ہے۔ اس کے نیچے یوتھ کانگریس کی ایک ریلی کا اعلان ہے۔ اور پاس ہی ایک اجلا اور شفاف پوسٹر ایک نئے ہوٹل کے افتتاح کا ہے جس میں ہر اتوار اور عام چھٹی کو جیم سشن، موا کرے گا۔ اس کے پیچھے اس سے بڑا ہے لیکن

اِدھر اُدھر سے ادھڑ گیا ہے۔ صرف بالائی حصّہ سلامت ہے۔ جس پر ہائی اسکول اور کالج کے مختلف درجوں کے آرٹس اور سائنس کی جماعتوں کے کچھ نام ہیں اور نچلے حصّے میں ایک خانگی انسٹی ٹیوٹ کا پتہ چھپا ہے۔ اس کے برابر لیکن ذرا نیچے ایک بہت بڑے فلمی پوسٹر کا صرف وہ حصّہ دکھائی دے رہا ہے جس پر کانچ کا ایک بہت بڑا جام بنا ہے اور اس میں شراب کی جگہ ایک رقاصہ دکھائی دے رہی ہے۔ باقی حصّے کو کئی چھوٹے بڑے اشتہاروں اور پوسٹروں نے ڈھک دیا ہے جن میں سے ایک کا عنوان ہے "علم و عرفان کی بارش"۔ ایک مقامی حکومت کی جانب سے شراب بندی ہفتے کی تشہیر کا ہے۔ اس کے پیچھے ایک انگریزی اسٹیج ڈرامے کا اشتہار ہے جس کے چار جلی الفاظ تو صاف دکھائی دے رہے ہیں Who is afriad of . . . آگے کے الفاظ ایک اور پوسٹر نے نگل لئے ہیں جو سارے شہر میں ایک مخصوص تاریخ کو ہر صنعت اور ہر شعبے کی عام اور مکمّل ہڑتال کی اپیل کر رہا ہے اور نیچے کے الفاظ پر ایک اور ہی پوسٹر نے پردہ ڈال دیا ہے۔ جو ایک مشہور ماکسسٹ لینن نسٹ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کی آمد اور جلسے سے متعلق ہے۔ اس سے متصل کسی بنگالی فلم کا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک پوسٹر پر بنا ہوا صرف تازہ ترین ڈزائن کا ایک جوتا ہی دکھائی دے رہا ہے اور اس سے چپکا ہوا ایک بڑی سیاسی جماعت کے جلسے کا اعلان کر رہا ہے جس کی سُرخی ہے "جمہوریت اور سوشلزم کو بچاؤ"۔ یہ بہت ہی پُرانا ہو چکا ہے۔ اس سے لگ کر ایک اور دوسری بہت بڑی سیاسی جماعت کا باتصویر پوسٹر اس کے سالانہ اجلاس کا ہے۔ "بمبئی چلو"۔ اس کے نیچے خاندانی منصوبہ بندی کا سرکاری پوسٹر ہے جس پر چہروں کے خاکے رہ گئے ہیں لیکن الفاظ پھاڑ دیئے گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے اس کے نیچے کا پوسٹر دکھائی دے رہا ہے، جس پر ایک فلم اسٹار ایک مخصوص برانڈ کی سگریٹ پی رہا ہے اور سگریٹ کا دھواں اُوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اٹھتے ہوئے دھوئیں کے رُخ پر مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن کا پوسٹر ہے جس میں احمد آباد کے فسادات میں بے گھر اور تباہ و برباد ہونے والوں کی بحالی اور امداد کے لئے چندے کی اپیل کی گئی ہے۔ اس کے پیچھے وہ بہت ہی پُرانا لگا ہوا تھا جس کے کچھ حصّوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گئو رکھشا سمیتی کا ہے۔ ایک قربانی کی کھالوں کا عطیہ

مانگ رہا ہے۔ اس کے نیچے بنکوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ ورنہ ہڑتال کی دھمکی اور تاریخ درج ہے اور عوام سے حمایت کی درخواست کی گئی ہے۔ اس سے متصل والے پر "اشیر واد" ہے۔

سرکس کے پھٹے ہوئے لمبے چوڑے پوسٹر پر ایک طرف بنا ہینڈل کی ایک پہیئے کی سائیکل ہے اور اس کی سیٹ پر بلاؤز اور تنگ پتلون پہنے ایک عورت سر کے بل کھڑی ہے۔ اس کے برابر ایک نیا پوسٹر کانگریس کے نئے صدر کے خلاف احتجاج کر رہا ہے کہ اس نے دس سال سے انکم ٹیکس نہیں دیا ہے اور اس حصے کے اُوپر، جہاں شیر اسٹول پر اپنے دونوں اگلے پیر اٹھائے بیٹھا ہے اور سامنے رنگ ماسٹر ہنٹر لہرائے کھڑا ہے۔ ایک فورم کی جانب سے بنکوں کو قومیانے پر عوام کی مسرت کے اظہار اور حکومت کو مبارک باد دینے کے لئے جلسہ طلب کیا گیا ہے اور ایک دوسرا جنوبی ہند کی کسی زبان میں ہے جو شمالی ہند والوں کی سمجھ سے باہر ہے اور جہاں ایک چھوٹا سا ہرا طوطا اپنی چونچ سے ایک رتھ گھسیٹ رہا ہے، جس پر ایک بھاری بھرکم کئی رنگوں والا پردیسی طوطا سوار ہے، اسی کے پہلو میں ایک صنعتی ترقی کی نمائش کا ہے۔ چھوٹی بچت کی اسکیم کا سرکاری اشتہار بھی یہیں لگا ہے اور اس سلسلے میں بریبرن اسٹیڈیم میں ہونے والے فلمی ستاروں کے کرکٹ میچ کا بھی۔ ایک انڈو پاک مشاعرے کی تاریخ اور جگہ اور اس میں حصہ لینے والے شاعروں کا اعلان کر رہا ہے۔ اور اسی پر "اپنے ملک کے بچاؤ میں حصہ لینے" کی اپیل والا ہے۔

اس کے نیچے سے کسی اور پوسٹر کا ایک حصہ باہر نکلو ہوا ہے جو فلم "اونچے لوگ" کا ہے۔ اور اسی کے ساتھ کچھ پھٹا ہوا اور کچھ نمایاں اعلیٰ نسل کے کتوں کی نمائش کا ہے۔ اور ساتھ ہی چند نامور قوالوں کے مقابلے کا۔ کسی پر بلگام کے لئے آخری قطرۂ خون تک بہا دینے کی ایک مہاراشٹری نیم سیاسی نیم سماجی جماعت کی دھمکی ہے جس پر چھایا ہوا ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کا پوسٹر ہے جو بڑے مہذب اور با اخلاق انداز میں کہہ رہا ہے۔ "اپنے ملک کو پہچانو، اپنے ملک کو دیکھو" اور اس سے نیچے کی طرف نکلا ہوا انگریزی کا وہ

پوسٹر ہے جو اُردو کو ایک ذیلی علاقائی زبان قرار دینے کی کانفرنس سے متعلق ہے۔ اس کے پاس ہی ایک مشہور کلچرل جماعت کے میوزیکل کنسرٹ کا ہے۔ نچلے کونے میں "مارچ آف نیشن" کا ایک پرانا ماسٹ ہیڈ ہے جو جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا ہے۔

بُری طرح پھٹے ہوئے پوسٹروں میں سے اور کہیں کہیں بچی ہوئی جگہ سے کانگریس اور دوسری سیاسی جماعتوں کے انتخابی نشانات کے کچھ حصّے نظر آرہے ہیں جو دیوار پر چونے سے لگائے گئے ہیں۔

اس دیوار کی بنیاد میں یہاں سے وہاں تک فضلہ ہی فضلہ اور پیشاب ہی پیشاب ہے۔ دُور دُور تک بدبو ہی بدبو ہے۔

●●

کیلی ڈسکوپ

نٹ راج اپنے پیر میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں میں سے صرف ایک کو حرکت دیتا ہے۔ بائیں جانب کی کہکشاں اپنے راکھشسی ناچ کا ایک توڑا لیتی ہے۔ یم دُوت کی بے آواز تھاپ پر اس کا انگ انگ ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور وہ چھوٹتے ہوئے انار کی رنگ برنگی چنگاریوں کی طرح دوسری سینکڑوں ہزاروں کہکشاؤں میں جا گرتا ہے۔ ایک چنگاری میری جڑوں میں آ گرتی ہے جو خلا میں کئی کروڑ نوری برس تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مجھ میں رُوح سرایت کر جاتی ہے اور میں اس جہنم کی اس قدر گہری اکتا دینے والی بے حسی کو ایک بھرپور انگڑائی کے ساتھ جھٹکتا ہی ہوں کہ جنّت سے فرار ہونے والا سانپ مجھ سے لپٹ جاتا ہے اور اپنی زبان کی نوک سے میرے سینے پر دل کا خاکہ کھرچتا ہے اور اس کو چھیدتا ہوا ایک تیر کریدتا ہے۔

ایک شاعر کمپیوٹر کا بٹن دباتا ہے اور ساتھ ہی کمپیوٹر کے احساسات شاعر کے ذہن میں ٹیلیوائز ہو جاتے ہیں۔ مفلس فرشتے کئی پُرانی دنیاؤں کی تخلیق اور کئی دُنیاؤں کی تخریب کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ مرّیخ کے اُس پار والے ٹیلی اسٹار سے ٹکرا کر آنے والی شعاعیں مجھے اِکس رے پلیٹ بنا دیتی ہیں۔ میرے سراپا پر لیڈی گوڈیوا کے بالوں کی وِگ چڑھ جاتی ہے۔

"میری نجات کیا اس جہنم میں بھی نہیں؟"

کئی ہزار جغرافیائی طبیعاتی برسوں تک میں یہ سوچتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ ایک اور گوتم بدھ آ کر میری کوکھ میں سمادھی لگاتا ہے اور میرے سوچنے کا فرض اپنے ذمّہ لے لیتا ہے۔

ایک مُستطیل اپنی ہیئت بدل کر دائرہ بن جاتا ہے۔ وقت کی سطح کھُردری ہو جاتی ہے۔ مہنجوڈارو

کی جانب سے پتھر کے کلہاڑے میری طرف دوڑ پڑتے ہیں اور مجھ پر برستے ہوئے اندھا دھند میری جڑوں کو کاٹنے لگتے ہیں۔ کاٹتے رہتے ہیں۔ پھر میں گر جاتا ہوں، گرتا ہی رہتا ہوں اور صدیوں تک گرنے کی حالت میں رہتا ہوں۔ جیسے کششِ ثقل کا اصول جامد ہو گیا ہو۔

.... صلیب کا تمغہ جنگ میں سب سے زیادہ تباہی اور بربادی کرنے والے بہادر کے سینے پر لگ جاتا ہے۔ افیون کی گولیاں چھین لی جاتی ہیں اور سیسے کی گولیاں مشین گنوں میں ڈال کر کھلائی جاتی ہیں۔ سیب کی وضع کا ٹھوس اصلی سونے سے بنا ہوا اُڑن کھٹولہ زہرہ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ شیولنگ دُودھ سے غسل کرتا ہے ....

میں چُپ چاپ سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور میری آنکھوں سے سفید خون بہنے لگتا ہے۔ نوح مجھے اکھاڑ کر اپنی کشتی میں لے جاتے ہیں اور وہاں مجھے ایک محفوظ جگہ گاڑ دیتے ہیں۔ کشتی کی زمین مجھے راس آجاتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ ایک سیاہ پتھر کی شکل اختیار کر لیتا ہوں۔ نوح کی کشتی جب ایک ریگستان میں گنا ہوں کا کارگو چڑھاتے ٹھہرتی ہے تو کچھ سوداگر مجھے چپکے سے اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور ایک مقدس جگہ نصب کر دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ میں چاند سے گرا ہوا ایک ٹکڑا ہوں۔ یہ سُن کر شنکر کے ماتھے پر چسپاں قمر کی لَو تیز ہو جاتی ہے۔ حُور شمائل کنیزیں برہنہ ہونے لگتی ہیں۔ گنبد اُبھرتے ہیں اور مینار کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نیویارک سے آزادی کا بُت اپنے پیروں پر اُونچا ہو کر مجھے دیکھتا ہے۔ لیکن میں اپنی جگہ نہیں ہوں۔ وہ اور بلند ہو کر مجھے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور دونوں کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑا کر انجمنِ اقوامِ متحدہ کی عمارت پر گر جاتا ہے اور یہ عمارت اتنے خوفناک دھماکے سے گرتی ہے کہ اس کی گونج ویت نام اور چیکوسلواکیہ تک سُنائی دیتی ہے۔ سورج دیوتا نے ہیروشیما کی بددعا آخر قبول کر لی۔ مقدس پاپ گہری سوچ میں گم ہے۔

لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ میری جڑوں کا آخر پتہ چل جائے تو مجھے تلاش کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ اندھیروں میں رینگتا رینگتا نوری سال سے ٹکرا جاتا ہوں اور اس میں ترخ پیدا ہو جاتی ہے۔ نوری سال طیش میں پلاسٹر آف پیرس کی ایک بوری مجھ پر دے مارتا ہے۔ میں بوری گھسیٹ کر لے جاتا ہوں

اور عقاب کے سائز کا کبوتر بناتا ہوں۔ اس کی چونچ میں کاغذ کی بنی ہوئی زیتون کی شاخ پھنسا دیتا ہوں۔ وہ اُڑنے سے پہلے ہی زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے پیٹ سے بہت سارے انڈے نکل کر بکھر جاتے ہیں۔ ایک انڈے کو توڑ کر اُس کے اندر سے ایک میزائل نکلتا ہے اور اس طرف روانہ ہوتا ہے جہاں مہابھارت کا ناٹک ہو رہا ہے۔

"انسان بن کر پیدا ہونا بڑی نعمت ہے" ارجن سے بھگوان شری کرشن کہہ رہے ہیں "فرشتے بھی اس اعزاز کے لئے ترستے ہیں، کیونکہ صرف انسان ہی اعلیٰ ترین دانشمندی اور انتہائی بے لوث محبت سے سرفراز کیا گیا ہے"

نیزوں پر قرآن بلند کر دیئے جاتے ہیں۔ خلافت کے لئے جنگ ہو رہی ہے کیونکہ خُدا ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے آدم کو رُوئے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔

میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں اور بھاگتے بھاگتے دیوارِ چین تک پہنچ جاتا ہوں جس پر ثقافتی انقلاب کی آمد کے پوسٹر لگے ہیں۔ میں ایک پیش رو طویل زقند Great leef forward لگاتا ہوں اور چین کے ماضی میں داخل ہو جاتا ہوں۔ کنفیوشس سے میری ملاقات ہوتی ہے اور میں اس سے اپنی خیریت پوچھتا ہوں۔ وہ مجھے ایک سٹیلائٹ میں بٹھا کر دُنیا کے گرد چکّر لگانے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ میں ایل۔ ایس۔ ڈی کی گولیاں کھا لیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ دریائے نیل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور ہر ایک ٹکڑا الگ الگ رنگ سے رنگا ہوا لہرا کر آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہے اور دوسرے تمام ٹکڑوں سے ہر ایک ٹکڑے کی آمیزش ہو رہی ہے۔ سٹیلائٹ ایک جگہ ساکن ہو جاتا ہے اور روئے زمین کی رصدگاہیں اس نئے سیارے کی دریافت پر جشنِ چراغاں سے دلہن بن جاتی ہیں۔ کوئی مچھلی مجھے نگل لیتی ہے اور اس کے عجائب گھر میں مجھے بھُس بھر کر ایک دیوار پر سجا دیا جاتا ہے

شفق کے فرش پر ایک ناچ ہو رہا ہے۔ ناچنے والے اور ناچنے والیاں آہستہ آہستہ اپنا لباس اُتار دیتے ہیں اور جب ناچ اپنے نکتۂ عروج پر پہنچتا ہے تو مادہ نر بن جاتی ہے اور نر مادہ بن جاتا ہے۔ خون کی تازہ تازہ شراب کے نشے میں دُھت ہو کر سب اپنی اپنی ہونے والی اولادوں کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ وینس کی پتھر کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور وہ ایک خواب دیکھنے لگتی ہے۔

میں دُنیا ترک کر کے آرو بندو آشرم میں داخل ہوتا ہوں۔ مہاتما گاندھی کا بلاوا آتا ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑوں۔ میں انھیں جواب دیتا ہوں کہ پہلے میں اپنے آپ سے تو آزاد ہو جاؤں۔ میرے جواب کو یورپ کے اخبار سنسنی خیز انداز میں شائع کرتے ہیں اور وہاں مشرقی فلسفے کی نشاۃ الثانیہ شروع ہوتی ہے۔ منی کرشنا مورتی بھارت ناٹیم کے لئے اور علی اکبر خان سرود بجانے کے لئے یورپ کا دورہ کرتے ہیں۔ جرمنی کے گاؤں گاؤں سے یوگا کی بھول بھلیاں گذر جاتی ہے۔

جنگ اس لئے کی جاتی ہے کہ امن قائم ہو۔ اس لئے ہمیشہ امن برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ جنگ ہوتی رہی۔ اس نظریے پر امن کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے اور اسی روز گاندھی، کینڈی اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو گولی مار دی جاتی ہے۔ میں اپنا منہ پلٹا لیتا ہوں اور مُستقبل کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

کوسوں تک ریت ہی ریت ہے جس پر گُل مُہر کا پیڑ اکیلا کھڑا ہے۔ وہ اپنی وحشت ناک تنہائی سے گھبرا کر اپنے پلاسٹک کے پھولوں سے چمٹ جاتا ہے۔ ان گنت ستاروں سے جڑیں پھوٹ پھوٹ کر اس کی طرف لپکتی رہتی ہیں۔

●●

روزنامچے کا ایک ورق

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ہدایت کے مُطابق الارم سروس مجھے ٹھیک وقت پر جگا دیتی ہے۔

میں ملازم کو خبردار کرنے کے لئے برقی گھنٹی کا بٹن دباتا ہوں۔

برابر کی میز پر رکھے ریڈیو ٹرانسسٹر کو چلاتا ہوں۔ تازہ تازہ خبریں سُنتا ہوں۔ جن میں اہم یہ، ہیں کہ ایک پس ماندہ مُلک نے اپنے دشمن مُلک کے خلاف ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک سے جدید ترین، مہلک سائنسی اسلحہ جات کے لئے گذارش کی ہے۔ صدر جمہوریہ نے ایک بہت بڑے اور نئے صنعتی کارخانے کا افتتاح کیا۔ ایک بوئنگ ۷۰۷ ہوائی جہاز کا حادثہ ہوا جس میں کئی سو ہلاک ہوگئے۔ اور سیٹلائٹ کے ذریعے حاصل کی ہوئی اور محکمہ موسمیات کی جاری کردہ اگلے چوبیس گھنٹوں کی پیشین گوئی ہے۔

ملازم میرے پاس ٹرالی لاکر کھڑا کر دیتا ہے جس میں بجلی کے چولھے پر بنائی ہوئی چائے ہے۔ وہ میرے کمرے کا ایئر کنڈیشنر بند کر دیتا ہے۔ پھر ہر ایک کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور ننھی ننھی چرخیوں سے گذرنے والی ڈوریاں کھینچتا ہے۔ وینیشین چلمنیں اُٹھ جاتی ہیں اور وہ کھڑکیاں کھول دیتا ہے۔

چائے پی کر میں تازہ اور سوندھے تمباکو اور اس کے لئے ضروری کاغذ کو مشین میں جما دیتا ہوں۔ بنا بنایا سگریٹ اپنے آپ کو پیش کرتا ہے

کموڈ سے اُٹھ کر میں فلش کا ہینڈل دباتا ہوں۔ پھر میں کموڈ سے قریب ہی ایک چھوٹے سے فوّارے کو چلا کر اُس کے اُوپر ایک خیالی کُرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میری صفائی بھی ہو جاتی ہے۔

آٹومیٹک ٹوتھ برش سے میں اپنا منہ صاف کرتا ہوں۔

بل وارک کی مدد سے ورزش کرتا ہوں۔ پھر ڈبلا کرنے والی مشین پر ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے جیسے دوڑتا رہتا ہوں۔

الیکٹرک ریزر سے اپنی ڈاڑھی بناتا ہوں۔ پھر الیکٹرک مساجر سے اپنے رخسار ملائم کرتا ہوں۔

گیزر کو چلا کر گرم اور ٹھنڈے پانی کا تناسب مقرر کرتا ہوں۔ کنکنے پانی کا شاور باتھ لیتا ہوں۔

اسکوٹر کے اسٹارٹ کئے جانے کی آواز آتی ہے۔ میرا لڑکا اسکول جا رہا ہے۔

پیرمبولیٹر میں پڑی سب سے چھوٹی لڑکی صبح کی ہوا خوری سے لوٹ رہی ہے۔ دودھ پینے کی بوتل اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے اور اس کا نپل چوس رہی ہے۔

بالوں کو سکھانے والی مشین میں سر دیئے بیٹھی میری بیوی کٹر اور فائل کی مدد سے اپنے ناخن سنوار رہی ہے۔

ایک نوکر ویکوم کلینر سے ملاقاتی کمرے کی صفائی کر رہا ہے۔

ناشتے میں ڈیمنائزڈ بریڈ کا ٹوسٹ ہے جو ٹوسٹر میں سنک کر خود اوپر اٹھ جاتا ہے۔ مشین کی مدد سے تخلیق کئے ہوئے پولٹری فارم کے بڑے بڑے انڈے تلے رکھے ہیں۔ پیسچرائزڈ مکھن ہے۔ مشینوں سے تیار کیا گیا ہے اور بوتل بند کیا گیا ہے۔ نہایت لذیذ مارملیڈ ہے۔ مکسر سے نکلا ہوا اور فرج میں ٹھنڈا کیا گیا آم کا جوس ہے۔ آرے ملک کالونی کا مہیا کیا ہوا دودھ ہے۔ انسٹنٹ کافی ہے۔

بیوی کے لئے ضروری ہدایات ٹیپ پر ریکارڈ کر دیتا ہوں۔

میں اپنی کلائی پر بندھی آٹومیٹک گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں۔

ہندوستانی ٹیریلین کی قمیض اور جاپانی ڈبل نٹ پولیسٹر کا سوٹ زیب تن کئے، جرمن نکٹائی اور فرنچ سنٹ لگائے، آٹومیٹک پالش سے چمکتے ہوئے امریکن جوتے پہنے میں اپنی مرسیڈیز اسپورٹنگ چلانے لگتا ہوں، جس میں بٹن دبانے سے ہڈ خود ہی چڑھ یا اتر جاتا ہے۔

گیئر خود بخود تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس میں ریڈیو سیٹ بھی ہے۔ بار بھی ہے۔

ایک جگہ سڑک پر رولر اسکیٹنگ کرتے ہوئے ایک لڑکے کے برابر سے میری کار نکل جاتی ہے۔

سُرخ، زرد اور سبز روشنیوں کی آنکھ مچولی دیکھتا بے شمار ٹریفک سگنلوں سے گذر جاتا ہوں۔

ایک بتیس منزلہ عمارت میں داخل ہو کر اسکیلیٹر کی مدد سے لفٹ تک پہنچتا ہوں۔ آٹومیٹک لفٹ مجھے تیرھویں منزل پر، جہاں میرا آفس ہے، پلک جھپکتے میں لے آتی ہے۔

ڈور کلوزر کی وجہ سے میرے ایئر کنڈیشنڈ چیمبر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

ٹیلیکس کے ذریعے آئے ہوئے کچھ کاروباری پیامات میری میز پر رکھے ہیں۔ اُن میں سے ایک کے ہنگامی جواب میں میں ایک سمندر پار کال نیویارک کے لئے بُک کرتا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں دوسرے فریق سے شخصی طور پر تفصیلی بات چیت ہو جائے گی۔

میں ڈکٹافون پر خطوط کے مضامین بولنے لگتا ہوں جنھیں بعد میں ٹائپ کر دیا جائے گا۔

میں انٹر کام کے ذریعے اپنی سکریٹری طلب کرتا ہوں۔ وہ عادت کے مطابق اپنی مسکراہٹ، کولپ اسٹک سے رنگے ہوئے اور اپنی ٹانگوں کو اسٹاکنگز کی مدد سے پُرکشش بنائے ہوئے آتی ہے۔

کمپیوٹر کی مدد سے میں اپنی صنعتوں، اُن کی پیداوار اور فروخت، خام مال کی خرید، نفع نقصان نظم و نسق، اور مزدوروں کی کارکردگی اور اجرت کے مسائل سے وقتاً فوقتاً واقف ہوتا رہتا ہوں۔

میں دن بھر اپنے آفس میں ایک مشین کی طرح کام کرتا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔

شام کو سینما ہاؤس چلا جاتا ہوں۔ سائنس فکشن کی فلم ضرور دیکھتا ہوں، ورنہ کلب چلا جاتا ہوں، جہاں گھر اور خاندان جیسا ماحول ہے۔

اس کے بعد بار میں اکیلا بیٹھا وہسکی پیتا ہوں۔ اس دوران اپنی کاروباری پیچیدگیوں

پر غور کر کے انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آئندہ کے منصوبے تیار کرتا ہوں۔

کسی اعلیٰ ہوٹل میں ڈنر کھاتا ہوں، جہاں کئی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کا گھر میں پکنے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا اور ساتھ ساتھ بجلی کے سہارے بجائے جانے والے سازوں پر ہونے والے کیبرے اور اسٹرپ ٹیز کا لطف اُٹھاتا ہوں۔

کیلکولیٹنگ مشین سے لگی مُہر اور مندرجہ رقم والے بل کو لے آتا ہوں، جو کاروباری تفریح کی مد میں چلا جائے گا۔

رنگ برنگے اشتہاری نیون سائنز کے جلتے بجھتے رہنے سے پیدا ہونے والے اور بدلتی روشنیوں کے عجیب عجیب منظر دیکھتا اور اسٹرپ ٹیز کرنے والی، بھرپور بدن اور متناسب اعضاء والی رقّاصہ کا تصوّر کرتا رات بڑی دیر گئے گھر لوٹتا ہوں۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ ٹیلی ویژن سٹ کھلا پڑا ہے۔ ایک طرف سے کپڑے دھونے والی مشین کی آواز آ رہی ہے اور دوسری طرف سے برتن دھونے والی مشین کی۔

میں اپنی بیوی کے پاس لیٹ جاتا ہوں۔ اس کے پجامے کی زِپ کو کھولنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ جھٹک کر الگ کر دیتی ہے۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ میں کوئی بچے جننے والی مشین ہوں؟" وہ کروٹ بدل لیتی ہے اور مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے۔ "اور یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ صرف تمھارا جب جی چاہے تم میرے کپڑے اُتارنے لگو۔ کچھ دیر پہلے مجھے بڑی شہوت ہوئی تھی۔ تم تھے نہیں۔ میں نے وائبریٹر سے اپنی جنسی تسکین کر لی ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب سونے دو مجھے۔"

میں اپنی شلف کھولتا ہوں اور اُس میں سے ربر کی پوری عورت کا لپٹا لپٹایا مجسّمہ نکال کر اُس میں ہوا بھرنے لگتا ہوں۔

●●

پاسپورٹ کی شناخت

خبر شائع ہو چکی تھی کہ پولیس کو ایک پاسپورٹ ملا ہے، جس کا ہو وہ دفتر کے اوقات میں ہیڈ کوارٹرز سے حاصل کرے۔"

ڈپٹی کمشنر نے اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی اپنے پرسنل اسسٹنٹ سے پوچھا۔

"پاسپورٹ لینے کے لئے کوئی آیا؟"

"یس سر۔"

"اندر بھیج دو اسے۔"

پرسنل اسسٹنٹ باہر چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنے میز کی ایک دراز کھول کر پاسپورٹ نکالا اور اسے کھول کر وہ تصویر دیکھ ہی رہا تھا کہ تصویر کا مشابہ داخل ہوا۔ اس کا قد چھ فیٹ سے بھی اُوپر تھا۔ خوبصورت چہرہ، رنگ سرخ، آنکھیں سیاہ، بھویں گنجان، انگریز لگ رہا تھا۔

"تمہارا نام؟"

"لارنس میک برائیڈ۔"

"عمر؟"

"چھبیس سال۔"

"آئرش؟"

"یس سر۔"

"تمھارا یہ پاسپورٹ کیسے گم ہوا؟"

"پتہ نہیں سر۔ میں آئرش ری پبلکن آرمی کا سپاہی ہوں۔ برطانوی فوج سے برسوں سے لڑ رہا ہوں۔ خانہ بدوش زندگی ہے۔ پتہ نہیں آئرلینڈ میں میرا پاسپورٹ کب گم ہوا۔"

"مگر"... ڈپٹی کمشنر نے حیرت سے کہا۔ "یہ پاسپورٹ ہمیں آئرلینڈ سے نہیں، یہاں کے...."

لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کا پرسنل اسسٹنٹ داخل ہوا، اور کہنے لگا۔

"سر۔ اس پاسپورٹ کا ایک اور دعوے دار آیا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ بے ارادہ بولا۔

"واٹ نان سنس! یہ پاسپورٹ تو لارنس میک برائیڈ کا ہے۔ اس کا نام اس میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا فوٹو اس میں لگا ہے اور وہ سامنے کھڑا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے میک برائیڈ کو دیکھا جس کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہیں تھا، جس کے رویے میں کوئی احتجاج نہیں تھا۔ وہ اپنے فوٹو کی طرح بے جان لگ رہا تھا۔

ڈپٹی کمشنر نے پاسپورٹ بند کر کے میز پر جیسے پھینک دیا اور اپنے پرسنل اسسٹنٹ سے بولا۔

"اس کو بھیج دو اندر۔"

ایک شکیل نوجوان داخل ہوا۔ وہ یوروپین لگ رہا تھا۔ نہ اس نے میک برائیڈ کو دیکھا اور نہ میک برائیڈ نے اس کو۔

"لگتا ہے تمھارا پاسپورٹ بھی کھو گیا ہے۔" ڈپٹی کمشنر نووارد سے مخاطب ہوا۔

"یس سر۔"

"نام؟"

"ولیم زٹر لنگ۔"

"جرمن؟"

"یس سر"

"ولیم" ڈپٹی کمشنر نے اس کی طرف پاسپورٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لو۔ یہ تمھارا پاسپورٹ نہیں ہے۔"

ولیم نے پاسپورٹ کھول کر دیکھا اور فوراً ڈپٹی کمشنر کو لوٹاتے ہوئے بولا۔

"سر۔ یہ پاسپورٹ میرا ہی ہے۔"

"ڈونٹ بی اسٹوپڈ!" ڈپٹی کمشنر نے دانت چباتے ہوئے کہا، اور ساتھ ہی اس کی نظر ولیم کے ہاتھ میں اس کی طرف بڑھے ہوئے اور کھلے ہوئے پاسپورٹ پر گئی۔

"او، نو" اور ڈپٹی کمشنر نے پاسپورٹ اپنے ہاتھ میں لے کر فوٹو کو دیکھا اور اندراج پڑھنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاسپورٹ وہی تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ولیم کا تھا۔

میک برائیڈ کے فوٹو کی جگہ ولیم کی فوٹو لگی تھی۔ سبھی اندراج ولیم کی شخصیت کے مطابق تھے۔ ڈپٹی کمشنر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اس تبدیلی کو ولیم کا ایک شعبدہ سمجھنے لگا۔ وہ کبھی پاسپورٹ کو دیکھتا، کبھی ولیم کو اور کبھی میک برائیڈ کو۔

"میں جرمنی کے ریڈ بریگیڈ کا ممبر ہوں۔ ایک دفعہ جرمن پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی جس سے بھاگتے ہوئے میرا یہ پاسپورٹ کہیں گر گیا۔"

"لیکن یہ پاسپورٹ ہمیں جرمنی سے نہیں، یہیں سے ملا ہے۔" ڈپٹی کمشنر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہی آپ بولا۔ "کہیں سے بھی ملا ہو۔ جہنم سے ملا ہو۔ لیکن یہ بدل کیسے گیا؟"

ولیم کے پاس سے ہٹ کر وہ اپنی میز اور آفس کی پچھلی دیوار کے درمیان ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے کچھ دیر ہو گئی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سر اُٹھایا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میک برائیڈ اور زٹر لنگ کے ساتھ ایک اور نوجوان کھڑا تھا۔

"تم؟ کون ہو تم؟"

ڈپٹی کمشنر نے بھڑک کر پوچھا۔

"قاسم علوی۔"

"کون قاسم علوی؟"

"پی۔ ایل۔ او کا ممبر۔ لبنان کی سرحد پر اسرائیلی فوج کے ایک دستے سے جھڑپ کے دوران میرا پاسپورٹ کھو گیا۔"

"یہ پاسپورٹ تمہارا ہے نہ یہ ہمیں لبنان کی سرحد سے ملا ہے۔" یہ کہہ کر ڈپٹی کمشنر میز کی طرف بڑھنے لگا۔ "یہ دیکھو۔"

ڈپٹی کمشنر کھلے ہوئے پاسپورٹ کو اٹھاتے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر قاسم علوی کے فوٹو پر گئی جو ولیم زٹرلنگ کے فوٹو کی جگہ لگی تھی۔ باقی اندراج قاسم علوی کی شخصیت سے میل رکھتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر چکرانے لگا۔ وہ جلدی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں کے سہارے اپنا سر تھام لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحوں بعد ڈپٹی کمشنر نے ہاتھ ہٹا لئے، سر اٹھایا اور کن انکھیوں سے کھلے پاسپورٹ کو دیکھا۔ قاسم علوی کے فوٹو کی جگہ ایک جاپانی نوجوان کا فوٹو دکھائی دیا۔ اب یہ پاسپورٹ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مشینی سرعت کے ساتھ اس نے پاسپورٹ بند کر دیا اور سامنے نظر ڈالی۔ قاسم علوی کے برابر وہی جاپانی کھڑا تھا۔ اور اس کے برابر ایک سیاہ فام، اور اس کے برابر ایک ہپی جو چرس کی بدبو میں بسا ہوا تھا۔

"سر، میرا نام ٹکا ٹیرو یمادا ہے۔ میں نے جاپان ایئر لائنز کا ایک ہوائی جہاز ہائی جیک کیا تھا تاکہ اپنے ملک والوں کی توجہ جاپان کی پرانی تہذیبی روایات کی تجدید پر مبذول کرواؤں۔ اس ہنگامے میں میرا پاسپورٹ کہیں گم ہو گیا۔"

"اور میں ہوں سولومن ایکس۔ امریکا کا سیاہ فام مسلم۔ کوکلکس کلین کے چند بدمعاشوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، لیکن ان میں سے ایک کو میں نے مار ڈالا اور بھاگ نکلا۔ اس گڑبڑ میں میرے بیگ سے پاسپورٹ گر گیا۔"

ڈپٹی کمشنر پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے پاسپورٹ کی جلد ذرا سی کھول کر اندر دیکھا۔ اس میں سیاہ فام سولومن ایکس کی فوٹو لگی تھی۔ اس نے پاسپورٹ کو فوراً بند

کر کے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

"میں ایک کینیڈین ہوں۔" ہپی بولا۔ "تنگ دستی سے مجبور ہو کر، ایک جعلی پاسپورٹ بنانے والے ماہر کو میں نے کل ہی اپنا پاسپورٹ بیچ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے میرا ہی پاسپورٹ کھو دیا ہو۔ میں برسوں سے غیر ملکوں میں گھوم رہا ہوں اور غیر ملکی تہذیبوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں کے ساتھ، اپنے خاندان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ سر، بڑی مہربانی ہوگی اگر۔۔۔"

"شٹ اپ۔" ڈپٹی کمشنر نے اسے ڈانٹا۔

"یہ پاسپورٹ تم میں سے کسی کا نہیں ہے اور تم سبھی کا ہے۔ یہ تم میں سے کسی کو نہیں ملے گا۔ میں اسے جرائم کے عجائب گھر بھیج دوں گا۔ کیونکہ اس کا ہر دعوے دار مجرم ہے اور ہر دعوے دار کے ساتھ اس کے فوٹو اور اندراج بدل جاتے ہیں۔"

جرائم کے عجائب گھر کے نگران کار نے سیل بند لفافہ کھولا۔ ڈپٹی کمشنر کا نوٹ پڑھا اور بڑی دلچسپی سے اس نے پاسپورٹ کھولا۔ پاسپورٹ میں کوئی فوٹو نہیں تھی، کوئی اندراج بھی نہیں تھا۔

●●

الم اور اوم

ہاتھ میں عصا، انگلیوں میں انگوٹھیاں، بدن پر عبا، گلے میں مالائیں، ٹخنوں تک شرعی پاجامہ، پیروں میں پھٹے پُرانے جوُتے، سر پر بہت بڑا عمامہ، ریش اور زلفیں بے ہنگم اور پھیلی ہوئی۔ سب کچھ تو ہے لیکن اس درویش کا چہرہ نہیں ہے۔ چہرے کی جگہ صرف خلا ہے۔

"بابا تمھارا چہرہ کیا ہوا؟"

بھاری آواز میں گھُلی ہوئی ایک ہنسی گونجتی ہے۔ پھر "اللہ ہو" کا ایک گھن گرج نعرہ سنائی دیتا ہے اور حکم ہوتا ہے۔

"بند کر اپنی آنکھیں"

فوراً بے ارادہ میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور اب کسی سادھو کا پُرنور چہرہ میری نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی پیشانی پر شیو جی کے پیروں کی مخصوص تین آڑی لکیریں صندل سے بنی ہیں جو ایک دوسرے سے قوسین کے ذریعے متصل ہیں۔ اس سادھو کا کوئی سراپا نہیں۔ چہرہ فضا میں معلق ہے۔ اُس کی آنکھوں کے ڈھیلوں میں پتلیاں نہیں ہیں۔ سفیدی پر چھائی ہوئی سُرخی اور سرور صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور وہ ایک مخصوص لے میں پڑھتا ہے۔

"اوم نمے شوائے"

اس کی اور درویش کی آواز ایک ہی ہے، لیکن لہجہ الگ ہے۔

"بول ہمیں تو کیوں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"تم کو پہچاننے کے لئے۔"

"اب پہچان لیا؟"

"نہیں جی۔ اب تو پہچاننا اور مشکل ہو گیا ہے۔"

"سُن۔ گیان کبھی آنکھوں سے نہیں ملتا۔"

"جی۔"

"بول اوم پدمائے نمئے۔"

"اوم پدمائے نمئے۔"

"اب کھول دے اپنی آنکھیں۔"

بس اپنی آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میں اپنی پلکیں بار بار جھپکاتا ہوں۔ لگتا ہے میری آنکھوں کے ڈھیلے تحلیل ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ صرف خلا ہے۔ میں اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگتا ہوں۔ اور گھبرا کر چلا جاتا ہوں۔

"گرو جی ... گرو جی ... گرو جی ..."

کوئی جواب نہیں ملتا۔ جواب کا انتظار کر کے میں پھر چلا جاتا ہوں۔

"بابا ... بابا ... بابا ... بابا ..."

پھر بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ اور میں جواب کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔

سنّاٹے کا ایک یُگ گزر جاتا ہے۔

اس اندھے پن میں لڑکھڑاتا ہوا میں چلنے لگتا ہوں۔ چلتا رہتا ہوں۔ چلتا ہی رہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا ہے، لیکن کوئی طاقت مجھے دھکیل رہی ہے۔ اور میں چل رہا ہوں۔ یکایک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایڑیوں کے بَل پیچھے کی طرف چل رہا ہوں۔ پتہ نہیں کب تک اور کہاں تک چلتا رہتا ہوں۔ ایک جگہ تھک کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مجھے

لگتا ہے کوئی چیز میرے پیروں سے لپٹ رہی ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوں۔

"سانپ!"

ایک ہنسی گونجتی سُنائی دیتی ہے اور آواز آتی ہے۔

"ہاں، سانپ۔ لیکن میں وہ سانپ ہوں جو انسان کو علم دیتا ہے۔ میں نے ہی آدم اور حوّا کی جہالت دُور کی تھی۔ انھیں گیان دیا تھا۔ اُن دونوں کو اُن کے جسموں کا شعور دیا۔ ان کی جنس کا احساس دلایا۔ جسم اور جنس کا عمل سمجھایا جس کی بدولت انھوں نے وہ تلذّذ حاصل کیا جو آج صرف انسانوں ہی کا نہیں، علم و فن کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔"

"لیکن تم نے وہ علم دیا جس نے آدم کو خدا سے دُور کر دیا۔ مجھے تو وہ علم وہ گیان چاہیئے جو مجھے خُدا، یا جو اس کا نام ہو، سے قریب کر دے۔"

"یہ علم ابھی مجھے بھی نہیں ملا۔ ہر مخلوق کی طرح میں نے بھی اپنی پیدائش کا مقصد پُورا کر دیا۔ مجھے بہکانے کی ہدایت ہوئی، میں نے بہکا دیا۔ اور اگر صحیح راستہ دکھانے کی توفیق ہوئی، تو وہ بھی کر دوں گا۔ آدم اور حوّا کو جنّت واپس جانے کا راستہ دکھا دوں گا۔"

"مگر اب تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

"تمھاری طرح میں بھی اپنا انجام ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اور بڑی تیز سرسراہٹ سے وہ غائب ہو جاتا ہے۔

میں پھر اپنی راہ لیتا ہوں۔ چلتا رہتا ہوں۔ کوئی آواز کسی طرف سے نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک سنّاٹا ہے۔

سنّاٹے کا اور ایک یُگ گزر جاتا ہے۔

ٹٹول ٹٹول کر، چلتے چلتے، بڑھتے بڑھتے، میں ایک بار لڑکھڑاتا ہوں۔

"ارے ارے۔ اندھا بچارا!" گرو جی کی آواز آتی ہے۔ پھر وہ اپنے مضبوط ہاتھوں سے مجھے تھام لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"تم بھگوان کو ڈھونڈھنے چلے ہو۔ وہ ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا۔ اُسے سمجھنے کی کوشش

کرو۔"

"میں اسے جتنا سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ مجھ سے اتنا ہی دُور ہوتا جا رہا ہے۔"

یکایک گرو جی کا قہقہہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ پھیلتا اور بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گونج کے سینکڑوں اور ہزاروں دائروں کی لہر در لہر پیدا ہوتی ہے۔

میں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ مجھے سناٹے کا احساس ہونے لگتا ہے اور جیسے ہی میں اپنے کانوں سے ہاتھ ہٹا لیتا ہوں تو سچ مچ سناٹا ہے۔

سناٹے کا اور ایک یُگ گذر جاتا ہے۔

ٹٹولتا ٹٹولتا، لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا، میں چلتا رہتا ہوں۔

اندھیرے میں مجھے نور کا ایک سپنا سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مجھے کچھ گیان ہونے لگا ہے۔ میں کچھ سمجھنے تو لگا ہوں۔ لیکن کیا سمجھنے لگا ہوں، یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ کوئی چیز میرے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ یہ ایک پیتل کا مجسمہ ہے۔

"آ میرے بچے۔ میں تجھے گیان دُوں گا۔" مجسمہ مجھ سے کہتا ہے۔

"تم کون ہو؟"

"سدھارتھ۔"

"اوہ۔ بھگوان بُدھ۔ مجھے گیان دیجئے۔ بتائیے خدا کون ہے۔ کہاں ہے۔"

"وہ شبدوں سے مہان ہے۔ ابھی ویکتی کے گھیرے سے باہر ہے۔ اسے انوبھو میں گرہن کیا جا سکتا ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"تپسیا سے۔ تپسیا کرو۔"

"مگر یہ تو وہ گیان نہیں ہے جو آپ مجھے دینے والے تھے۔"

"او شبیہ یہ گیان نہیں ہے۔ کنتو یہ گیان کی اور پہلا سنکیت ہے۔ میں بھی اسی راستے سے گیان تک پہنچا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے پیتل کا وہ مجسمہ میری بانہوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

میں پھر بڑھنے لگتا ہوں۔ اب میرا ایک قدم وزنی ہو جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں تھک کر میں چلتے چلتے اپنی رانوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ رانیں مجھے پیتل کی لگتی ہیں۔ میں گھبرا کر اپنے سارے جسم کو ٹٹولتا ہوں۔ سارا جسم پیتل کا ہو چکا ہے۔ میں ایک جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔ پدماسن اختیار کر کے گیان دھیان کرنے لگتا ہوں۔

ہر طرف خاموشی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔

سناٹے کا اور ایک یُگ گزر جاتا ہے۔

یکایک ایک مہیب اور خوفناک دھماکے سے میں چونکتا ہوں۔

"یہ کیا؟"

"یہ ایٹم بم ہے۔ دُنیا کا سب سے پہلا ایٹم بم، جو میری نگرانی میں بنایا گیا اور آج تجربے کے طور پر گرایا گیا۔"

"کون ہو تم؟"

"اوپن ہائمر۔ اپنی آنکھیں کھولو اور دیکھو کیا منظر ہے اور روشنی کا کیا جلوہ ہے۔"

"مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم ہی بتاؤ کیا دکھائی دے رہا ہے؟"

"مجھے بھگوان سری کرشن کے وہ الفاظ دکھا دے رہے ہیں، جو انھوں نے ارجن سے کہے تھے کہ اگر تم ایشور کو دیکھ لو، تو لگے گا جیسے ہزاروں لاکھوں سورج تمھاری نظر کے سامنے روشن ہو گئے ہوں۔"

اِن سُروں سے آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھُلنے لگتی ہیں۔ دیکھنے کے لائق ہو جاتی ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہ زمین ہے، نہ آسمان ہے، ہر طرف خلا ہی خلا ہے اور اس خلا میں ایک چہرے کا خاکہ اُبھرنے لگتا ہے اور اجاگر ہو کر بھرپور چھا جاتا ہے۔ اس چہرے کا کوئی جسم نہیں ہے۔ اس کی گردن میں پھانسی کا پھندہ ہے۔ اور گردن کی پُشت پر پھندے کی رسی کچھ دُور اوپر اُٹھی ہوئی ہے۔ اس کا سرا معلق ہے۔

میں اس چہرے کو غور سے دیکھتا ہُوں تو مجھے یہ اپنا ہی چہرہ لگتا ہے۔ نقوش ایرانی سے ہو گئے ہیں۔ ریش اور زلفیں لہرا رہی ہیں۔ چہرے پر ایسا نور میں نے آج تک کسی کے نہیں دیکھا۔

"کون ہو تم؟" میں حیرت اور دلچسپی سے پُوچھتا ہُوں۔

چہرہ تو میرا ہی ہے، لیکن گرو جی کی آواز میں جواب ملتا ہے۔

"انا الحق"

مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب مَیں، مَیں نہیں ہُوں۔

●●

کنفیشن

ننھّا سا فرشتہ کہنے لگا۔ "یہ دُنیا میری مسکراہٹ کی طرح معصوم ہے۔"

ہالے کے زیور سے سجی مدر میری کی پورٹریٹ بولی۔ "گناہ اگر کوئی چیز ہے تو سب سے بڑی گنہگار میں ہوتی۔"

اور کانٹوں کا تاج پہنے یسوع مسیح نے کہا۔ "میری میگڈلین کو اُس کے گناہ کی سزا میں صرف وہی آدمی پتھر مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔"

چرچ کی دیواروں پر اُوپر کی طرف سے بنے ہوئے لال، پیلے، نیلے، ہرے سبھی رنگوں کے شیشوں سے تشکیل دی ہوئی تصویریں اور مناظر فادر ربیلو تیس پینتیس سال سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن تین تصویروں سے آج اُس نے نوُر کی کرنوں کی طرح پھُوٹتی ہوئی آوازوں کو پہلی بار سنا تھا۔

سرمن ختم ہو گیا۔ گھنٹہ بجنے لگا۔ آرگن اُبھرنے لگا۔ حمدیہ ترانہ گونج اُٹھا۔

فادر ربیلو نے ترانہ گانے والوں کو ایک نظر یہاں سے وہاں تک دیکھا۔ مسز فلورنس بریٹو، مسز الیزا کیٹلینو، مس سارا مسکرینس، مسز میٹرین البوکرکے، مسز ڈیبرا ڈی سوزا، مس کرسٹابل ڈی پینا، اور وہ سبھی عورتیں دکھائی دیں جو اپنے حسن کے لئے مشہور اور جوانی کے لئے بدنام تھیں، جن کے گناہ، خاص طور سے جنسی گناہ، ناجائز جنسی فعل کے اعتراف، کنفشن، اُس نے سنے تھے، جن کی بخشش کے لئے اُس نے دعائیں کی تھیں، جن کو اس نے کفارہ بھی بتایا تھا۔ ایسے گنہگار مرد اور ایسی گنہگار عورتیں اس پیرش میں بہت سی تھیں۔ ربیلو کے خیال

میں یہی گناہ سب سے زیادہ عام ہو گیا ہے کبھی کبھی عجیب بھی ہو جاتا ہے جیسے مس ریٹا سیکوئرا کا کنفشن۔ وہ کوئی تیرہ یا چودہ سال کی تھی۔ اس نے کنفشن کیا کہ اب وہ کنواری نہیں رہی۔

"خداوند یسوع مسیح کی تم پر رحمت نازل ہو" فادر ربیلو نے کہا کہ "تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کر رہا ہے"

"فادر" ریٹا بولی "مجھے پتہ نہیں ضمیر کیا ہوتا ہے۔ میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ کسی لڑکی کا کنواری رہنا آج کل فیشن کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ شادی کے بنا جنسی فعل گناہ ہے۔ بس یونہی کنفشن کے لئے آ گئی"

یا پھر کرسٹابل ڈی پینا کا کنفشن۔ وہ زنا بالجبر کا شکار بننے کے بعد اس کے پاس آئی تھی۔

"میری پوری پوری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے" یہ کہہ کر فادر ربیلو اس کے لئے دعا کرنے ہی لگا تھا کہ کرسٹابل نے قطع کلام کیا۔

"فادر! میرے لئے نہیں، اُس آدمی کی بخشش کے لئے دعا کرو۔ گناہ میں نے نہیں اُس نے کیا ہے۔ یہی کام وہ مجھے منا کر اور میری رضامندی سے بھی کر سکتا تھا"

حمدیہ ترانے گانے والوں میں اُسے انورادھا جوشی نہیں دکھائی دی۔ فادر ربیلو کو احساس تھا کہ وہ گنہگار تو ضرور ہے مگر اُس نے کبھی اپنے کسی گناہ کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انورادھا کبھی چرچ نہیں آتی۔ پھر بھی اُس کی آنکھیں انورادھا کو ہمیشہ چرچ میں ڈھونڈتی رہتی ہیں، جیسے خود فادر ربیلو کو اُس سے کنفشن کرنا ہو۔ جیسے انورادھا ہی اُس کی بخشائش اور نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

انورادھا تین چار سال پہلے اس پیرش میں رہنے کے لئے آئی تھی۔ وہ کوئی ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ وہ مس سارا میسکرینس کی پے انگ گیسٹ تھی۔ ایم۔ اے تھی۔ اور پونہ سے آئی تھی اور بمبئی کے مضافات میں کسی کالج میں لکچرر ہو گئی تھی۔ انورادھا کا پردادا بائبل کا مراٹھی ترجمہ کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ اور اپنی ذاتی عقیدت مندی سے کیتھلک ہو گیا تھا۔

ایک بار جب فادر ربیلو سارا کے گھر گیا تھا تو اُس نے انورادھا کا تعارف یہ کہہ کر کروایا تھا کہ وہ کٹر کیتھلک ہے۔ یہ سُن کر فادر ربیلو کو بڑی مسرّت ہوئی تھی۔ اُس کی ایک خوبی جو فادر ربیلو نے خود ہی دیکھ لی تھی، وہ تھا انورادھا کا جسم۔ پُونہ کی چت پاون برہمن عورتیں اپنی خوبصُورتی اور صحت مند جسم کے لئے مشہُور ہیں، مگر انورادھا کا جواب تو شاید اُن میں بھی نہ ملے۔ اس کے گداز بدن کا تناسب، گولائیاں اور نشیب و فراز کی لکیریں دیکھتے ہی فادر ربیلو کو اپنے زندگی بھر کنوارے رہنے کی قسم یاد آ گئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اور انورادھا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نہ جانے کب تک دیکھتا رہا۔ سارا کافی کی ٹرے لے آئی۔ وہ چونک اٹھا۔ جانے سے پہلے وہ سب سے پیار اور محبّت کرنے کی تلقین کرنے لگا۔

فادر ربیلو کو انورادھا کسی بھی خاص یا عام عبادت میں کبھی نہیں دکھائی دی، لیکن جب بھی وہ کسی جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھتا تو اُس میں اُسے انورادھا دکھائی دینے لگتی۔ جب بھی اس کی نظر چرچ کی دیواروں پر رنگین شیشوں سے بنے چہروں پر جاتی تو اُسے ہر ایک میں صرف انورادھا ہی دکھائی دیتی۔ ننھے فرشتوں میں، مریم میں، یسوع مسیح میں۔

ایک روز وہ بے اختیار انورادھا سے ملنے چل پڑا۔ انورادھا گھر پر اکیلی تھی۔ سارا، جو پیشہ ور نرس تھی، ڈیوٹی پر گئی ہوئی تھی۔ انورادھا اور ربیلو آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ انورادھا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"میں جانتی تھی تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے!"

فادر ربیلو کو جھٹکا سا لگا، سنبھل کر بولا "پیرش کا دورہ کرنا اور سب کی خبر رکھنا ہمارا فرض ہے۔"

"یہ تو ایک بہانہ ہے۔" انورادھا کے طنز کے شیشے کا رنگ اور گہرا ہو گیا، جس میں ربیلو کو اپنے روحانی خدوخال نظر آنے لگے۔

"بہانے کی کوئی بات نہیں۔" ربیلو نے کچھ خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "سارا نے بتایا تھا تم ایک کٹر کیتھلک ہو، لیکن چرچ میں کبھی نہیں دیکھا تم کو۔"

"نہ ہی میں کٹر کیتھلک ہوں اور نہ چرچ جاتی ہوں۔ وہ تو اس کنواری بُڑھیا سارا

نے شرط رکھی تھی کہ وہ کسی کٹر کیتھلک ہی کو کمرہ کرایہ پر دے گی، تو میں نے بھی کہہ دیا کہ میں کٹر ہوں۔ آٹھ دس سال پہلے ضرور تھی، لیکن اس سے مجھے بڑا نقصان ہوا۔"

"کیسے؟" فادر ربیلو نے حیرت سے پوچھا۔

"کالج میں ایک بڑا ہی خوبصورت اور شریف لڑکا میرا دوست تھا، صادق مسیح۔ انورادھا کھڑکی سے دُور افق کی طرف دیکھتے ہوئے اور ماضی میں گم ہوتے ہوئے بول رہی تھی۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن میں راضی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ میں خالص برہمن کیتھلک تھی اور وہ مسلمان پروٹسٹنٹ"۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ "اس وقت کتنی بیوقوف تھی میں۔ اب ایسا پیار کرنے والا مجھے پھر نہیں ملے گا۔"

فادر ربیلو نے سوچا کہ وہ صادق مسیح سے زیادہ اُسے پیار دے سکتا ہے۔

انورادھا نے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا اور آگے کو گری ہوئی زلفوں کی پوری لٹ، جس سے اُس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا، پیچھے چلی گئی۔

فادر ربیلو اُس کے دلی سکون کے لئے دُعا کرنے لگا۔

"رہنے دو فادر"۔ انورادھا نے ٹوکا۔ "مجھے یہ مکّاری بالکل پسند نہیں۔ ان دعاؤں سے نہ کچھ ہوا ہے نہ کچھ ہوگا۔ سب ڈھونگ ہے، چاہے کوئی مذہب ہو۔ اپنے شدید احساسِ خوف پر غلبہ پانے کے لئے انسان نے گھڑ لی ہیں یہ باتیں۔ خُدا اور مذہب اور مقدّس کتابیں اور . . ."

"خُدا تمھیں صحیح راستہ دکھائے۔"

"صحیح راستہ مجھے کارل مارکس دکھا چکا ہے۔ مگر سارا سے یہ نہ کہہ دینا، ورنہ وہ مجھے دھکّے دے کر گھر سے نکال دے گی، پھر میں کہاں رہوں گی؟ تمھارے پاس؟ ہوں۔" اور وہ مسکرانے لگی۔

فادر ربیلو کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

"اوہو! بڑا شاک لگا تمھیں۔ لیکن دل میں تو انار پھوٹ رہے ہوں گے۔"

فادر ربیلو سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"اچھا فرض کرو، میں تمھارے کوارٹرز میں آکر رہنے لگوں، کیا کرو گے تم؟ میں تمھارے ہی کمرے میں رہوں گی۔ تمھارے بستر پر سوؤں گی۔ تمھارے ساتھ۔ بولو کیا کرو گے؟"

فادر ربیلو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

"مائی گاڈ!" اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ پھر اچانک اُٹھ کر نظریں نیچی کئے تیزی سے نکل گیا۔

فادر ربیلو کو پھر کبھی انورادھا کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انورادھا ویسے ہی چرچ میں نہیں آتی تھی۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ اُسے کم سے کم دُور ہی سے دیکھ لینے کی تمنا میں فادر ربیلو جینے لگا۔

ایک روز اس سے رہا نہ گیا۔ سارا جب ماس سے لوٹنے لگی تو فادر ربیلو نے اُس سے کہا۔

"سارا، انورادھا کو ماس میں کیوں نہیں لاتیں؟"

"کہاں سے لاؤں فادر۔ وہ تو کب کی چلی گئی۔"

فادر ربیلو کو بڑی ٹھیس لگی۔ اُس کی نظر اُوپر رنگین شیشوں کے مناظر پر چلی گئی۔ یسوع مسیح سے صلیب سے لٹکتے نظر آئے۔ کچھ بلندی پر فرشتے پرواز کر رہے تھے۔

کوئی ایک سال گذر گیا۔

ایک روز وہ کنفشن باکس میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ہلو فادر!"

انورادھا کی آواز سُن کر فادر ربیلو کو جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ وہ سہم بھی گیا۔

"کہاں رہیں اتنے دنوں؟" ڈرتے ڈرتے فادر ربیلو نے پُوچھا۔

میں ایک نکسلائٹ سردار جی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ وہ کالج میں میرا شاگرد بھی تھا۔ پچھلے مہینے وہ ڈی آئی آر کے تحت جیل چلا گیا۔

"تو کیا بخشائش کے لئے...."

"جہنم میں جائے بخشائش۔ میں تو صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔ تم کو چھیڑنے آئی ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے مجھے۔ فادر، تم جیسا بڑی عمر کا لیکن دلچسپ آدمی مجھے بھانے لگا ہے۔ اچانک تمھاری یاد ستانے لگی۔ تم سے ملنے چلی آئی"۔

"یسوع مسیح نے اسی بہانے سہی تمھیں چرچ تو بھیج دیا۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے"۔

"تو یہ بھی سن لو کہ معجزہ کس قسم کا ہے۔ کچھ ہی روز ہوئے میں نے برلن فلم فسٹول کی رپورٹ پڑھی تھی۔ اس میں روم کی بنی ہوئی ایک فلم دکھائی گئی تھی۔ روم جو تمھارا مذہبی مرکز ہے۔ کہانی یہ تھی کہ ایک بڑے بدحال اور بے روزگار لیکن جوان اور صحت مند آدمی کو کسی نے رحم کھا کر اور جھوٹ موٹ گونگا بنا کر ایک ننری میں مالی کی نوکری دلوادی۔ کیونکہ وہاں کوئی مالن نہیں تھی اور ایک ننری میں مرد نوکر نہیں رکھے جاتے۔ روز رات کو باری باری ایک نن اس کے پاس جاتی اور جنسی اختلاط کرتی۔ ایک روز مدر سپیریئر بھی اس کے پاس چلی گئی۔ صحبت کے دوران مدر سپیریئر کی چیخ نکل گئی۔ مالی کے منہ سے بے اختیار نکلا "جیس کرائسٹ"۔ مدر سپیریئر حیران ہوگئی۔ اور اس کے نیچے سے چلاتی ہوئی نکل بھاگی۔"معجزہ! معجزہ!! گونگے کو زبان مل گئی۔ گونگا بولنے لگا۔ کرائسٹ کا زندہ معجزہ۔۔۔"

"پاگل لڑکی۔ نکل جا یہاں سے"۔ فادر ربیلو غصہ سے کھڑا ہوگیا۔ وہ کانپ رہا تھا—

"روح القدس مجھے اس کفر کے لئے معاف کرے جو میں تیری گندی زبان سے سن رہا تھا"۔

کچھ مہینوں بعد فادر ربیلو کو رجسٹرڈ پوسٹ سے ایک کتاب تحفے میں ملی۔ یہ انگریزی ناول "دی اکسارسسٹ" تھا۔ یہ تحفہ بڑے خلوص و احترام سے مس انورادھا جوشی نے بھیجا تھا۔ فادر ربیلو تاڑ گیا کہ اس میں بھی انورادھا کی کوئی شرارت ہے۔ اس لئے کئی مہینوں تک اسے ڈال رکھا۔ پھر بے پروائی کی جگہ آہستہ آہستہ کشمکش نے لے لی۔ اور اس شدید کشمکش ذہنی سے نجات پانے کے لئے اس نے چوری چھپے ناول پڑھنا شروع کردیا۔ پڑھتے پڑھتے ایک صفحہ ایسا آیا جس پر حاشیے میں سرخ پنسل سے ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ اس صفحے پر انتہائی وحشت، نادانی، اور بے اختیاری کے عالم میں، ایک چھوٹی سی دھاتی صلیب کے ذریعے ہیروئن کے جنسی تلذذ حاصل کرنے کا بیان تھا۔

"کاش وہ صلیب . . ."۔ فادر ربیلو سوچنے لگا۔

ایک روز وہ چرچ سے نکل کر اپنے کوارٹرز کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک اُسے وہی آواز آئی۔

"ہلّو فادر!"

فادر ربیلو کا دل دہل گیا۔

"پڑھ لیا وہ ناول؟" انورادھا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"پونٹف کی طرف سے اس ناول کا پڑھنا کیتھلکس کے لئے منع ہے۔"

"اچھا وہ صفحہ جس پر میں نے نشان لگایا تھا۔" انورادھا نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کیسا لگا؟"

فادر ربیلو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"دیکھو فادر! صلیب کے جنسی استعمال کو مذہبی نکتۂ نظر سے نہ دیکھو۔ اُس نے جو بھی کیا، اس کے تحت الشعور نے اُس سے کروایا، جو اس کی جبلّی ضرورت تھی۔ اس کے گھٹے ہوئے جذبات، دبی ہوئی خواہشیں، اور اُن کے ذمے دار وہ منفی اور غیر فطری سماجی اور مذہبی اصول۔"

"تم کیوں میرا وقت خراب کر رہی ہو!"

"تم ایک شتر مُرغ ہو فادر۔ حقیقتوں سے مُنہ چھپا کر سمجھتے ہو کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ارے میں کہتی ہوں جنسیات کے بنا زندگی کا مزہ ہی کیا۔ انسانوں میں، جانوروں میں، پرندوں، پھولوں . . ."

"تم انسان نہیں، شیطان ہو انورادھا۔"

"میں عورت ہوں۔ مریم کا روپ ہوں۔ مجھے بھی ایک مقدّس کنواری ماں سمجھو۔ کبھی مجھے تم پر ماں کی طرح پیار آتا ہے۔ کبھی میں تم کو اپنے باپ کے روپ میں دیکھتی ہوں۔"

"تم سچ مچ پاگل ہو۔"

"اور میں سمجھتی ہوں تم پاگل ہو۔ جنس کے مارے ہوئے ہو اور جنسیات سے نفرت کرتے ہو۔ فادر! ہر مذہب نے جنسیات کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ شیو لنگ دیکھا ہے کھاجوراہو

کا نام سُنا ہے؟"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔" فادر ربیلو جانے لگا۔

"ٹھہرو! ایک آخری بات اور۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم نے کبھی ایک جوان اور خوبصورت عورت کو ننگا نہیں دیکھا۔ تم نے کسی سے جنسی اختلاط نہیں کیا۔ تم نے زندگی بھر کنوارے رہنے کا جو حلف خود پر عائد کر لیا ہے وہ تمھارے لئے ایک رُوحانی کینسر بن گیا ہے، جس سے تمھاری موت بڑی اذیّت سے ہو گی۔ لیکن تم اس اذیّت کا اظہار نہ کر سکو گے۔ کیونکہ تم میں اپنی غلطی کے کنفشن کی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔"

فادر ربیلو کے ذہن میں انورادھا کا تصوّر دن رات رچا رہتا۔ کانوں میں اسی کی باتیں گونجتی رہتیں۔ کبھی کبھی مقدّس مریم کے مجسّمے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اسے انورادھا ہی دکھائی دیتی۔ جب بھی وہ پلپیٹ پر کھڑا ہوتا یا کنفشن سننے کے لئے تیّار ہوتا تو اُسے انورادھا کی تلاش رہتی۔ ماس میں کبھی کبھی انورادھا اُسے دکھائی دیتی۔ اور جب بھی اسے دیکھتا تو اپنی ہی طرف اسے تکتا اور مسکراتا ہوا پاتا۔ وہ گھبرا کر دوسری طرف نگاہیں پھیر لیتا۔ اسے کبھی یہ پتہ ہی نہ چلا کہ اُس نے سچ مچ انورادھا کو دیکھا ہے یا صرف اس کا تصوّر تھا۔ جب وہ بائبل پڑھتا تو انورادھا کی باتیں چھپے ہوئے جملے بن کر اس کے سامنے آجاتے۔ مراقبہ کرتا تو انورادھا کی صورت، جسم اور باتوں کے سوا وہ کچھ سوچ نہ پاتا۔ یہاں تک کہ مقدّس مریم کی شبیہہ کو گھیرا ہوا ہالہ اس کی روح میں پھیلتا گیا اور صلیب کا سایہ سکڑتا گیا۔ اور آج چرچ میں بیٹھے بیٹھے اُسے گیان مل گیا۔ رنگین شیشوں کی شبیہیں اس سے بول رہی تھیں۔ دُنیا اور زندگی اسے رنگین دکھائی دینے لگی۔

فادر ربیلو نے حمدیہ ترانے گانے والے مجمع پر نظر ڈالی۔ اسے وہ عورتیں بھی دکھائی دیں جنھوں نے ناجائز جنسی فعل کئے تھے۔ صرف انورادھا جوشی وہاں نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ گنہگار نہ تھی۔ وہ اسے مل جاتی تو فادر ربیلو اُسے اپنا فیصلہ سنا دیتا کہ وہ پریسٹ ہڈ سے استعفیٰ دے گا اور جیسے ہی اس کے حلف سے اسے آزاد کر دیا جائے گا، وہ انورادھا سے شادی کر لے گا۔ اور اگر وہ بنا شادی کے اس کے ساتھ رہنا پسند کرے گی تو اسے یہ بھی منظور ہو گا۔

اچانک فادر ربیلو کے بدن میں درد کی لہر دوڑی اور وہ دُہرا ہو کر گر پڑا۔

فادر ربیلو کی آنکھ کھلی۔ بڑی دیر بعد پُتلیوں میں روشنی آئی اور آہستہ آہستہ اُسے پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اس کے پاس اُس کے پادری ساتھی تھے میری اور لیزا اور سارا اور دیبرا بھی تھیں۔ انورادھا جوشی بھی تھی۔ سب کے چہرے اُسے اداس لگ رہے تھے۔ معصوم اور مقدّس بھی لگ رہے تھے۔ رنگین شیشوں سے تشکیل دی ہوئی شبیہوں کی طرح۔

"مجھے کیا ہوا انورادھا؟"

"کینسر!" انورادھا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "غذا کی نالی سے کینسر اچانک پھوٹ کر جگر کی طرف تیزی سے پھیل رہا ہے۔"

فادر ربیلو نے دیکھا کہ بھیگی بھیگی خلا میں گھڑی سے نکلتے ہوئے لمحے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور ایک اکٹوپس انھیں پکڑنے کے لئے اپنے بہت سے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔

انورادھا نے فادر ربیلو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

فادر ربیلو کی نظر کمرے کی دیوار پر لگی یسوع مسیح کی تصویر پر گئی، اور اس نے دیکھا کہ صلیب پر لٹکے ہوئے، کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے اور ہاتھ پیر لہولہان ہوتے ہوئے بھی یسوع مسیح کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔

●●

بھگوان سمپورنانند

گھرے اندھیرے آسمان میں ایک ستارہ بھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس میں اچانک ایک مہیب انار سا چھوٹا اور لاکھوں رنگین ستاروں کا ایک فوارہ سا ابل پڑا۔ اور واپس نیچے خلا میں گرتے ہوئے ستارے بجھ بجھ کر اندھیرے میں گھل مل گئے۔ چند لمحے پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا، کہ اچانک کئی میل لمبی ایک پھل جھڑی سی چھوٹی اور بے شمار کہکشائیں جگنوؤں کی طرح منتشر ہوگئیں اور ہزاروں لاکھوں نوری برسوں میں تحلیل ہوگئیں۔ پھر اندھیرا ہر سو ہوگیا۔ اچانک ایک جگہ پورا چاند عدم سے وجود میں آیا اور ہولے ہولے رقص کرنے لگا۔ اس ماہِ کامل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس سے الگ ہو کر زمین کی طرف آیا اور ایک گندے تالاب میں کھِلے ہوئے کنول پر آگرا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے تالاب کے کنارے جانکلی اور چاند کے اس گرے ہوئے ٹکڑے کو حسرت اور حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کا دل اُس چاند کے ٹکڑے کے لئے تڑپنے لگا۔ وہ اس کنول کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن تالاب میں اُترنے کی اُسے ہمّت نہ ہوئی۔ نہ تو اس کے قدم کنول کی طرف جا سکے، نہ ہی اس کا ہاتھ کنول تک پہنچ سکا۔ لیکن وہ اُس ٹکڑے کے لئے مچل رہی تھی۔ دھیمے دھیمے سُروں میں کہیں سے سنگیت سنائی دیا اور گھنگرؤں کی آواز آتے آتے قریب ہونے لگی۔ اور اونچی ہوتی گئی۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف پھیلے ہوئے گھنے جنگل کو دیکھنے لگی۔ پہلے تو اُسے کچھ ادھورے خاکے چلتے پھرتے دکھائی دیئے جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر یہ خاکے حسین چہروں اور جوان جسموں میں بدلنے لگے۔ جب ان حسیناؤں نے اُسے اپنے جھرمٹ میں لے لیا تو اسے پتہ چلا کہ

یہ اِندر کی اپسرائیں تھیں۔ ان اپسراؤں نے آگے بڑھ کر اُس کا لباس ایک ایک کر کے اتار دیا اور جب وہ بالکل برہنہ ہوگئی تو اُسے تالاب میں لے گئیں۔ تالاب کا گندا پانی آپ ہی آپ شفاف اور پاک صاف ہوگیا۔ اپسرائیں اُسے اشنان کروا کے تالاب کے کنارے لے گئیں تو کنول اپنے آپ حرکت کرتا ہوا اُس کے قدموں میں آگیا۔ اور اس پر گرا ہوا چاند کا ٹکڑا اٹھ کر اس کی کوکھ میں چلا گیا۔ اپسرائیں آناً فاناً غائب ہوگئیں اور اس کے بدن پر ایسا قیمتی اور خوش رنگ و خوش نما لباس اور بیش بہا زیورات نمودار ہوئے جو اس سے پہلے اُس نے کبھی نہیں دیکھے تھے ...

یہ سپنا مہامایا نے اپنے پتی کرنل مدھوسدن کو ناشتے کی میز پر سُنایا۔ کرنل مدھوسدن شری وستو کا ڈکٹیٹر تھا جو ہندوستان کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ کرنل مدھوسدن کو بڑا تعجب ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ٹیلیفون کر کے کلیش چترویدی کو بلوایا جو شری وستو یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر تھا اور خوابوں کی فرائیڈین تعبیر کا ماہر تھا۔ اس فن میں اسے بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ کلیش چترویدی نے مہامایا کا خواب پوری تفصیل سے سُنا اور بڑے گہرے غور و فکر میں مبتلا ہوگیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے پیشین گوئی کی مہامایا ضرور ماں بننے والی ہے اور اسے جو اولاد ہوگی وہ بہت خوبصورت، صاحبِ اقبال اور دانش مند ہوگی۔ کرنل مدھوسدن اور مہامایا کو اب تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یہ سُن کر بے حد مسرت ہوئی۔

چند مہینوں بعد مہامایا گربھوتی ہوگئی۔ شری وستو کے واحد ہسپتال کے گائنی ڈاکٹر نے بھی معائنہ کر کے تصدیق کر دی۔ گائنی کے جانے کے بعد مدھوسدن نے مہامایا کو لپٹا کر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ اس خبر کو شری وستو کے لانگ ویو والے چھوٹے سے ریڈیو اسٹیشن نے نشر کر دیا۔ اس خوشی میں تمام سرکاری دفاتر اور اداروں کو ایک روز کی تعطیل دے دی گئی۔ امیروں کو مٹھائی اور غریبوں کو مفت کھانا تقسیم کیا گیا۔

ڈلیوری کا وقت قریب آنے لگا تو کرنل مدھوسدن نے اپنے وزیرِ تعمیرات و رفاہِ عامہ کو حکم دیا کہ راجدھانی سے مہامایا کے مائکے تک جو راستہ ہمیشہ سے کچا اور اوبڑ کھابڑ رہا ہے، ہموار کیا جائے اور پکا بنایا جائے۔ اس وزیر نے سیکڑوں مزدوروں کو

اس کام کے لئے بے گار پر لگا دیا۔ دن رات کام چلتا رہا۔ سڑک تیّار ہو گئی۔ اور رواج کے مطابق مہامایا اپنی پہلی ڈلیوری کے لئے اپنے مائکے روانہ ہوئی۔ ہسپتال سے دو گائنی ڈاکٹر، چھ نرسیں اور دس مددگار ایک موبائیل آپریشن تھیٹر کو لئے مہامایا کے جلوس میں شامل ہو گئے۔ یہ جلوس راجدھانی سے چند کوس آگے اِملی بن تک ہی پہنچا تھا کہ مہامایا کو دردِ زہ ہونے لگا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے اسے موبائیل آپریشن تھیٹر میں منتقل کیا۔

کرنل مدھوسدن کو وائرلیس سے خبر دی گئی کہ مہامایا نے ایک صحت مند اور خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے۔ خوشی سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اپنی کسٹم میڈ رولس رائس میں املی بن کے لئے روانہ ہو گیا۔ مہامایا کو جتنے پیار سے اُس نے دیکھا اُس سے زیادہ پیار سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ گود میں اُٹھا کر اُسے پیار کیا۔ اور سمپورنانند اس کا نام رکھا گیا۔

سارے ملک میں یہ خبر پھیل گئی۔ سرکاری اعلان سے پیشتر ہی سرکاری دفاتر اور ادارے بند ہو گئے۔ یہ تعطیل عام جشن کے ساتھ منائی گئی۔ ملٹری بینڈ کے ساتھ شاہانہ جلوس راجدھانی میں داخل ہوا۔ امیروں نے اور وزیرِ خزانہ نے افراط سے غریبوں میں طرح طرح کے پھول تقسیم کر دیئے تھے، جنھوں نے تمام راستوں میں وہ پھول نچھاور کر کے جلوس کا استقبال کیا۔ جلوس کے محل پہنچنے کے بعد نذرانے پیش کئے گئے۔

سرکاری طور پر ایک ہفتے کے جشن کا اعلان کیا گیا۔ سارے شہر میں رات کو روشنی کی جاتی رہی۔ کرنل مدھوسدن کو جیوتش پر بڑا ایقان تھا۔ اس نے اپنے ایک وزیر کو چارٹرڈ پلین سے پڑوسی ملک ہندوستان کی راجدھانی دہلی روانہ کیا تاکہ وہاں کے وزیروں کو مشورہ دینے والے جیوتشیوں میں سے بہترین کا انتخاب کر کے لے آئے۔ فیس چاہے کتنی ہی بھاری کیوں نہ ہو۔ اس نے وزیرِ اعظم کے جیوتشی کو ساتھ لیا اور خفیہ طور پر دہلی کے ایک ادارے کو سمپورنانند کی پیدائش کی تاریخ، وقت اور مقام کا نام مہیا کر کے کمپیوٹر سے زائچہ بھی تیّار کروالیا۔

شری وستو کے راشٹرپتی کے دربار ہال میں مدھوسدن، مہامایا، وزیرِ اعظم، کابینہ کے دوسرے تمام وزراء، چیف آف آرمی، نیوی اور ائر اسٹاف، اعلیٰ عہدیدار اور

سبھی رئیس جمع تھے۔ جیوتشی نے زائچہ تیار کیا۔ پریذیڈنٹ نے اس کا تقابل کمپیوٹر کے پیش کردہ زائچے سے کیا۔ دونوں بالکل ایک جیسے تھے۔ وہ جیوتشی کی قابلیت سے متاثر ہو کر مسکرانے ہی لگا تھا کہ جیوتشی ہنسنے لگا۔ ہنستا گیا، ہنستا ہی رہا۔ اس کی ہنسی رفتہ رفتہ قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔ اُس کی اس بدتمیزی پر دربار میں موجود تمام حاضرین کو تعجب ہو رہا تھا اور غصہ آ رہا تھا۔ لیکن پریسیڈنٹ مدھوسدن نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو کسی اقدام سے منع کر دیا تھا۔ جیوتشی کی ہنسی اچانک بند ہو گئی اور وہ رونے لگا۔ بہت رویا۔ ہچکیاں لینے لگا۔ حاضرین کا تعجب پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ بڑی مشکل سے اُس کا رونا بند ہوا اور چپ سادھے بیٹھا رہا۔ پریسیڈنٹ مدھوسدن سے رہا نہ گیا اور اُس نے پوچھا۔

"پنڈت جی۔ پہلے تو آپ خوب ہنسے۔ پھر خوب روئے۔ عجیب بات ہے۔ اس کا کارن؟"

"راشٹرپتی! آپ کا بیٹا بڑا ہو کر انسان کے دُکھوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ بس، اسی بات پر مجھے ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔"

"ہم سمجھے نہیں۔"

"سمپورنانند بڑا ودوان اور گیانی ہو گا۔ دُنیا کے دُکھ اس سے دیکھے نہیں جائیں گے اور اُن کو سمجھنے کے لئے اُن کا حل ڈھونڈھنے کے لئے دُنیا تیاگ دے گا۔"

"سمپورنانند دُنیا تیاگ دے، یہ کبھی سمبھو نہ ہو گا۔" مدھوسدن گرج کر بولا۔ "ہم اسے رائل ملٹری کالج، سینڈھرسٹ یا امریکہ کے ویسٹ پوائنٹ میں بہترین فوجی تربیت دلوائیں گے۔ اُسے اپنا جانشین بنائیں گے۔ دُنیا کے بہترین جنرلوں میں اُس کا شمار کیا جائے گا۔ ایک ویر کا بیٹا ویر ہی ہو گا۔"

"میرا جیوتش کبھی غلط نہیں ہوا مالک۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بیٹا بڑا ہو کر دنیا تیاگ نہ دے تو ایک بات کا خاص دھیان رکھئے اور اس پر سختی سے عمل کیجئے۔ باقی اس کا نصیب!"

"ہم کوشش کریں گے۔ بتاؤ۔" مدھوسدن نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سرکار! راجکمار کو کبھی ایسا اوسر نہ ملے کہ وہ منشیہ کا کوئی دُکھ دیکھ لے۔ تو شاید۔۔"

دہلی کا پرچنڈ جیوتشی تو چلا گیا، لیکن کرنل مدھوسدن سے زیادہ جیوتشی میں وشواس رکھنے والی مہامایا کے دل پر شدید دورہ پڑا۔ شری وستو کے واحد ماہرِ امراضِ قلب نے اُسے بچانے کی پوری پوری کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مرنے سے پہلے مہامایا نے اپنے پتی کو وصیت کی کہ وہ مہامایا کی چھوٹی بہن گوری سے شادی کرلے، سمپورنانند ایک سوتیلی ماں کی بدسلوکی سے محفوظ رہے گا۔ مہامایا نے یہ بھی وصیت کی کہ وہ رسماً ایک سال تک شادی کا انتظار نہ کرے، جلد سے جلد یہ نیک کام کر ڈالے۔ مدھوسدن کو اس وصیت سے دل ہی دل میں بڑی مسرت ہوئی کیوں کہ گوری مہامایا سے زیادہ جوان اور سُندر تھی۔

جلد سے جلد کرنل مدھوسدن، پریسیڈنٹ شری وستو نے گوری سے شادی کرلی اور اس خوشی کے موقع پر اپنے آپ کو ترقی بھی دے لی۔ وہ بریگیڈیر کے رُتبے سے سرفراز ہوا۔

گوری سمپورنانند کے لئے سگی ماں سے بھی بڑھ کر پیار کرنے والی ثابت ہوئی۔

جیوتشی پریسیڈنٹ مدھوسدن کے دماغ میں ایک وہم چھوڑ گیا تھا۔ مدھوسدن نے طے کرلیا کہ سمپورنانند کو محل سے نکلنے ہی نہ دیا جائے اور اس کی تعلیم محل ہی میں بہترین استادوں کی نگرانی میں ہو۔ مدھوسدن اور گوری نے محلات اور باغوں میں بڑا خوشگوار ماحول پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ داسیاں، ناچنے اور گانے والیاں نوجوان اور ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت تعینات کی گئی تھیں اور ان کو چند ہی برسوں میں بدل دیا جاتا تھا۔ نوکروں، مالیوں، چوکیداروں اور موسیقاروں میں بھی سبھی صحت مند اور قبول صورت جوان تھے۔ ان میں کوئی بیمار ہوتا تھا تو اُسے محل سے باہر بھیج دیا جاتا تھا۔ کسی کی عمر بڑھنے لگتی تھی تو اسے برطرف کردیا جاتا تھا۔ باغ میں کوئی پھول یا پتہ مُرجھانے لگتا تھا تو مالی اسے فوراً توڑ کر باہر پھنکوا دیتے تھے۔

سمپورنانند آٹھ نو سال کا ہوگیا۔ وہ یوں تو اپنے چچازاد بھائی سوم دَت، پردھان منتری اور دوسرے منتریوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلوں میں حصّہ لیتا تھا لیکن زیادہ دیر کھیل میں لگا نہ رہتا اور سب سے الگ جاکر تنہائی میں کچھ سوچنے لگتا تھا۔ اُسے اپنی تنہائی میں کسی کی

خلل اندازی پسند نہیں تھی۔ اُس کی اس عادت کی رپورٹ گوری تک پہنچ گئی اور اس نے مدھوسدن کو بھی بتا دیا۔ جسے بڑی فکر لگ گئی کہ سمپورنانند کو تنہائی کی عادت سے کیسے بچایا جائے۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ کہیں سمپورنانند ابھی سے انسان کے دُکھوں کے واہیات موضوع پر دھیان گیان شروع نہ کر دے۔ اُس نے اپنے پردھان منتری، دوسرے سبھی منتریوں اور درباریوں سے مشورہ کیا۔ سبھی کا خیال تھا کہ سمپورنانند جیسے جیسے بڑا ہوتا جائے گا اس کی یہ کمزوری دُور ہو جائے گی اور وہ زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں محو ہونے لگے گا۔

لیکن الٹا ہی ہوا۔ جیسے جیسے سمپورنانند بڑا ہوتا گیا اُسے تنہا ہو جانے اور سوچ میں گم ہو جانے کی عادت بڑھتی چلی گئی۔ اس کی اس عادت سے سبھی پریشان تھے۔

اٹھارہ سال کا ہوتے ہوتے سمپورنانند بڑا قابل اور خوبصورت نوجوان بن گیا۔ اپنی فطری ذہانت کی بدولت وہ کئی علوم اور فنون میں ماہر تھا۔ اس کم سنی میں ایسی مہارت عدیم المثال سمجھی جاتی تھی۔

ایک روز پریسیڈنٹ مدھوسدن نے گوری سے کہا:

"گوری! راجکمار اب اٹھارہ سال کا ہو گیا ہے۔ اس کا بیاہ کسی بڑے اور اچھے خاندان میں کر دیتے ہیں۔ اس کی تنہائی دُور ہو جائے گی اور سوچ میں گم ہو جانے کی عادت بھی۔"

گوری نے فوراً اتفاق کیا۔

"تو ایسا کرتے ہیں، شری وستو میں تو کوئی لڑکی اس کے لائق نہیں۔ کسی پڑوسی دیش ہی سے ہمیں اپنے ملک کی بہو ملے گی۔ اس کے لئے ہم بڑی دھوم سے شری وستو میں اپنے دورِ حکومت کی سلور جوبلی منائیں گے اور پڑوسی ملکوں کے راشٹرپتی، پردھان منتری، منتری اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار مدعو کریں گے، اس طرح کہ وہ اپنے پریوار کے ساتھ آئیں گے اور ایک ہفتہ جشن کے ہنگاموں میں شریک ہوں۔ ان بڑے آدمیوں کی بیٹیوں میں سمپورنانند کو کوئی تو پسند آئے گی۔"

"خیال بہت اچھا ہے۔"

فیلڈ مارشل مدھوسدن پریسیڈنٹ فار لائف نے شری وستو میں اپنے دورِ حکومت

کی سلور جوبلی بڑے اعلا پیمانے پر منائی۔ پڑوسی ملکوں کے کئی بڑے بڑے پریوار آئے۔ ہر پریوار کے لئے نئی مرسیڈیز ایوی مہیّا کی گئی۔ ٹارمیک پر ہوائی جہاز سے ائرپورٹ کی عمارت تک سُرخ قالین بچھا کر ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ ائرپورٹ سے کئی کئی میل دُوران کے جائے قیام تک بھی سُرخ قالین سڑکوں پر بچھائے گئے تھے جن پر سے ہر پریوار کی مرسیڈیز آگے پیچھے موٹر سائیکل سوار محافظ دستوں کے ساتھ گزر گئی۔ حکومت کی جانب سے مہیّا کئے گئے پھول، جو بنگلور سے کئی چھوٹے ہوائی جہاز بار بار چکّر لگا کر درآمد کر رہے تھے۔ سڑکوں کے دونوں طرف جمع ہوئے عوام نچھاور کر کر کے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔

تمام مہمانوں کی آمد کے بعد مقرّرہ تاریخ پر شری وستو میں پریسیڈنٹ مدھوسدن کے پچیس سالہ دورِ حکومت کا جشن بڑی شاہانہ دھوم دھام سے منایا گیا۔ اے بی سی اور بی بی سی، دہلی دُوردرشن اور کئی ملکوں کے ٹیلی ویژن کیمرہ مین آئے تھے اور کئی سو اخباری نمائندے بھی۔ ٹائم اور نیوز ویک رسالوں نے شری وستو کی پچیس سالہ جمہوریت اور اس میں حیرت انگیز ترقی پر روشنی ڈالی۔

رات کو راشٹرپتی کے بینکوئٹ ہال میں یادگار ڈنر رکھا گیا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ایک الگ محل میں ڈسکو ڈانس اور ڈنر کا پروگرام تھا۔ سمپورنانند ایک جگہ چھوئی موئی بنا بیٹھا تھا۔ دوسرے سبھی لڑکے اور لڑکیاں رنگین روشنیوں کے سائیکے ڈیلک اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے نقش و نگار میں نہائے ہوئے اسٹیریو فونک مغربی موسیقی کی لَے پر مدہوش ہو کر رقص کر رہے تھے۔ اچانک ایک حور شمائل سمپورنانند کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ سمپورنانند نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا، اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے لگا جیسے اس کے دل کی ایک دھڑکن خطا ہو گئی۔

"مجھے وسندھرا کہتے ہیں" نغمگی سے لہراتی ایک آواز اُسے سُنائی دی۔

وسندھرا نے اپنا مرمریں ہاتھ آگے بڑھا دیا جو اشارہ تھا ڈانس فلور پر ساتھ جانے کا۔ سمپورنانند نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں فلور پر چلے گئے۔ دونوں رقص میں بہتے ہوئے جوڑوں میں کھو گئے۔ اس پر بھی وہ سب سے الگ دکھائی دے رہے تھے۔

سمپورنانند کا چچازاد بھائی سوم دت حسد سے جل گیا۔ وسندھرا سے جب اس نے ڈانس کرنے کی التجا کی تھی تو اُسے اس نے ٹھکرا دیا تھا اور سیدھی سمپورنانند کے پاس چلی گئی تھی۔

ڈسکو ڈانس کے حالات کی خفیہ رپورٹ مدھوسدن اور گوری کو مل گئی۔ معاملے کو آگے بڑھانے کے لئے سمپورنانند سے بھی اُس کی مرضی معلوم کر لی گئی جو بصد شوق وسندھرا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ وسندھرا کے ماں باپ سے مدھوسدن اور گوری نے باضابطہ سلسلہ جنبانی کی ——

وسندھرا کے ماں باپ خود ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست کے سابق راجہ اور رانی ہوتے ہوئے سمپورنانند سے اپنی بیٹی کی شادی اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی سمجھنے لگے کہ پچیس سال سے حکومت کرنے والے ایک گھرانے میں وہ بہو بن کر جائے گی اور ایک روز شری وستو کی رانی بنے گی۔ انھوں نے یہ شرط بھی منظور کر لی کہ شادی شری وستو ہی میں ہوگی۔

شادی کے بعد سمپورنانند اور وسندھر کا ہر دن ہولی اور ہر رات دیوالی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بنا ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ مدھوسدن اور گوری ان دونوں کی محبت بھری زندگی سے بڑے مسرور تھے۔ گوری سے کبھی کبھی وسندھرا یہ شکایت ضرور کرتی تھی کہ سمپورنانند ہر روز کسی نہ کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے خیالوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ اگر پوچھتی بھی ہے کہ سمپورنانند کیا سوچ رہا تھا، تو وہ ٹال جاتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سمپورنانند کی یہ عادت طویل وقفوں کی ہونے لگی۔ ایک سال گزر گیا اور وسندھرا کی گود بھی بھر گئی۔ سمپورنانند، مدھوسدن، اور گوری کی مسرّت بے پایاں ہو گئی

سمپورنانند کو فطرت کے تمام مظاہر سے الفت تھی۔ وہ رنگارنگ پودوں، پتّوں، پھولوں اور درختوں میں ہر بار ایک نئی دلکشی محسوس کرتا۔ پرندوں کی طرح طرح کی بولیوں سے اور ان کے پروں میں رنگوں کی شاہکار مصوّرانہ ہم آہنگی سے مسحور ہوتا۔ جانوروں کی آنکھوں سے ان کے جذبات سُنتا۔ چاند ستاروں کی بزم میں وہ خیالی پرواز کا لطف اُٹھاتا۔ سفید بادلوں کی بدلتی ہوئی شکل میں وہ کھو جاتا۔ سُرمئی گھٹاؤں اور ان کی رِم جھم بوندوں سے بڑی تسکین حاصل کرتا۔ اور تمام انسان تو اسے اپنے ہی لگتے تھے۔

ایک روز سمپورنانند اپنے محل کے باغ میں، جو اُفق تک پھیلا ہوا تھا، بڑی دیر سے

بیٹھا سوچ میں گم تھا۔ مدھوسدن وہاں آنکلا اور دُور سے اسے اس حالت میں دیکھ کر آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچا۔ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی شفقت سے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو بیٹے؟"

"سوچتا ہوں . . . اتنی بڑی دُنیا میں، میری دنیا کتنی چھوٹی سی ہے۔ بس اس محل اور اس باغ کی حد تک۔ اس کے باہر جو دُنیا ہے، میں وہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے شہر اور اپنی پرجا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ میں اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔" مدھوسدن نے سٹ پٹا کر جواب دیا اور چلا گیا۔

مدھوسدن نے اپنے وزیروں کو ہدایت کی کہ وہ شہر کو خوبصورتی سے سجائیں اور راجکمار کی سیر کے دن نہ تو کوئی بوڑھا، نہ کوئی بیمار اور نہ کوئی ارتھی نکلے۔ شہر میں جتنے صحت مند لوگ ہیں وہ اور کوئی کام نہ کریں اور راجکمار کے سواگت کے لئے سڑکوں کے دونوں طرف اکٹھے ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا۔ جوان اور صحت مند عوام کا ہجوم سڑکوں کے دونوں جانب اپنے راجکمار کا بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ اور آخر کار موٹر سائیکل سوار محافظ دستوں کے درمیان راجکمار کی نئی اور شاندار رولس رائس نمودار ہوئی۔ جھنڈیوں اور پھولوں اور "جے ہو" کے نعروں سے عوام نے جلوس کا استقبال کیا۔ کہیں جوان اور خوبصورت لڑکیاں ناچ رہی تھیں، کہیں نوجوانوں کی ایک ٹولی اپنے شہزادے کی شان میں ایک گیت گا رہی تھی۔ سمپورنانند نے اپنی پرجا کو کار سے بیٹھے بیٹھے دیکھا تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آگے شوفر کے پاس بیٹھے ہوئے اپنے سکریٹری سے اُس نے کہا۔

"ہماری پرجا کتنی صحت مند ہے۔ کتنی خوش ہے۔"

"بے شک یور ہائنس۔"

اچانک ایک نکڑ پر ایک بوڑھا جس کی کمر جھکی ہوئی تھی، اور جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھا اور جس کے ہاتھوں میں لاٹھی تھی، مجمع کو چیر کر بڑا خوش خوش آگے آکر کھڑا ہو گیا۔

اور شہزادے کو دیکھ کر اپنا ہاتھ اٹھا کر دوسروں کی طرح ہلانے لگا۔ ایک پولیس کانسٹبل نے دوڑ کر اس کو واپس مجمع میں دھکیل دیا۔ یہ منظر شوفر، سکریٹری اور شہزادے تینوں نے دیکھ لیا تھا۔ شوفر نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ سکریٹری سہم کر اپنی سیٹ میں دبک گیا۔ سمپورنانند کو بڑا تعجب ہوا۔

"یہ ہم نے کیا دیکھا؟"

"اس پر کچھ دھیان نہ دیجئے یور ہائنس" سکریٹری نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"لیکن .... لیکن ایسا آدمی ہم نے پہلی بار دیکھا ہے۔ اس کے چہرے اور بدن کی کھال کیسی تھی۔ اور .... کمر سے جھکا ہوا .... اور .... اس کی یہ ہڈیاں اور پسلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کیوں؟"

"وہ .... وہ بوڑھا ہو گیا ہے مالک۔"

"یعنی؟ ہم سمجھے نہیں۔ کیا وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے؟"

"جی نہیں۔ کبھی وہ ایک بچہ تھا، پھر جوان ہوا، اس کے بعد ادھیڑ اور اب بوڑھا ہو گیا ہے۔"

"تو کیا سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے؟"

"جی۔ یہ عمر کا تقاضہ ہے۔ جس کی عمر لمبی ہوتی ہے وہ آخر میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔"

"یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے۔ شوفر! واپس چلو۔"

جب مدھوسدن کو پتہ چلا کہ اس طرح راجکمار شہر کی سیر ادھوری چھوڑ کر واپس آ گیا تو اس نے اپنے منتریوں کو بہت ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ آئندہ پولیس اور سی آئی ڈی کا ایسا تساہل وہ برداشت نہیں کرے گا۔ اس نے طے کیا کہ اب راجکمار کو شہر کے کسی دوسرے حصے میں سیر کے لئے بھیجا جائے گا جہاں بڑا سخت بندوبست ہونا چاہیئے۔

دوسری بار بھی شہر میں سمپورنانند کے شایانِ شان استقبال ہوا۔ سڑکوں کے دونوں طرف ازدحام تھا۔ سمپورنانند بڑی مسرت کے ساتھ اپنی کسٹم میڈ رولس رائس میں گذر رہی رہا تھا کہ اُس نے ایک جگہ ٹھٹک کر دیکھا، سڑک سے متصل ایک ہسپتال کے دروازے سے ایک آدمی کھانستا اور خون تھوکتا باہر نکلا۔ ہسپتال کے دروازے پر ایک لمبا چوڑا سُرخ

کپڑا بندھا تھا اور اُس پر بڑے بڑے سفید حرفوں میں لکھا تھا۔ "ڈاکٹروں کی ہڑتال"۔ دو تین کانسٹبل دوڑ پڑے اور اسے گرفتار کر لیا۔ اتنے میں رولس رائس تیزی سے آگے نکل گئی لیکن سمپورنانند مبہوت رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے سکریٹری سے پوچھا۔

"یہ آدمی کھانس کیوں رہا تھا۔ اور خون کیوں تھوک رہا تھا"

"وہ۔۔۔۔ وہ بیمار ہے یور ہائنس"

"بیمار کیا ہوتا ہے؟"

"جب آدمی کی صحت خراب ہو جاتی ہے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے بڑی تکلیف ہوتی ہے"

"کیا یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے؟"

"یس یور ہائنس" ہر انسان کبھی نہ کبھی ضرور بیمار ہوتا ہے"

"یہ تو بڑے دُکھ کی بات ہے۔ شوفر! واپس چلو"

اس بار مدھوسُدن کا غصہ پہلے سے بھی زیادہ آگ اُگلنے والا ہو گیا۔ تمام منتری کانپنے لگے اور ان کے حلق سوکھ گئے۔ مدھوسُدن کا جی چاہتا تھا کہ انھیں فائرنگ اسکواڈ کی غذا بنا دے لیکن اس ڈر کے مارے کہ سمپورنانند کو یہ خبر نہ پہنچ جائے اور ان منتریوں کی لاشیں دیکھنے کے لئے وہ نہ آجائے، اُسے ضبط کرنا پڑا۔ تمام منتریوں نے اس سے حتمی وعدہ کیا کہ آئندہ اُن سے غلطی نہ ہوگی۔

چند روز بعد سمپورنانند کو شہر کی سیر کے لئے پھر بھیجا گیا اور پولیس کے ساتھ فوج کا بندوبست بھی کیا گیا۔ شہر کے صحت مند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے پُرجوش استقبال کیا۔ سمپورنانند اپنی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی نمائش کرتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی پرجا کو اپنی مسرت ظاہر کر رہا تھا۔ اچانک ایک آدمی شہزادے کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں سڑک عبور کر کے اُس طرف دوڑ کر آنا چاہتا تھا جدھر راجکمار بیٹھا تھا۔ چند فوجی سپاہی اور پولیس کانسٹبل فوراً اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ انھیں تعاقب کرتے دیکھ کر اس شہری کا گھبراہٹ سے پیر پھسل گیا اور وہ رولس رائس کے نیچے آگیا۔ شوفر

نے فوراً بریک لگایا اور ساتھ ہی ایک چیخ فضا میں لرز گئی۔ سمپورنانند کار سے اُتر آیا۔ سپاہیوں نے شہری کی ٹانگیں پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹا۔ یہ اس کی لاش تھی۔ سکریٹری اور شوفر بھی شہزادے کے پاس آگئے تھے۔ ایک سپاہی کے منہ سے نکلا "مر گیا!"

"مر گیا؟" راجکمار نے تعجب سے دہرایا۔ "کیا مطلب؟"

"یور ہائنس! آپ کار میں بیٹھئے۔ میں سب سمجھتا ہوں" سکریٹری نے لجاجت سے کہا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ ہجوم غم اور غصے سے احتجاجی نعرے لگا رہا تھا۔ سمپورنانند کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سکریٹری اور شوفر بھی۔ کار نکل گئی۔

"یور ہائنس کوئی چنتا نہ کریں۔ آج اُسے موت آنی تھی۔ وہ مر گیا۔"

"موت! مر گیا!" سمپورنانند کا تعجب اور بڑھ گیا۔ "موت کیا ہوتی ہے؟"

"موت ... مرتیو ... یوں سمجھ لیجئے ... زندگی کا خاتمہ ..."

"مگر زندگی تو دُنیا میں ہزاروں سال سے چلی آ رہی ہے"

"موت بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ ہر ہستی جو وجود میں آتی ہے اُسے فنا بھی ہونا ہے۔ یہ دُنیا چھوڑ کر جانا ہے۔"

"تو .... تو کیا میں بھی مر جاؤں گا" سمپورنانند اپنی زندگی میں پہلی بار ڈر گیا۔

"جی!" سکریٹری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

بڑی دیر تک سمپورنانند سوچ میں گم رہا۔ خاموش رہا۔ پھر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"بڑھاپا، بیماری، موت! دُکھ، دُکھ، دُکھ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے"

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس سے بھی بہت زیادہ ہوتا ہے" سکریٹری بے اختیار بولنے لگا جسے سکھانے کا شوق کچھ زیادہ ہی تھا۔ "اور آج تک یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ اُن بڑے بڑے رشیوں اور منیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آیا جنھوں نے یہ راز پانے کے لئے دُنیا تیاگ دی اور ساری زندگی گیان دھیان میں گزار دی۔"

"گیان دھیان؟" سمپورنانند نے دہرایا۔ سوچا۔ بولا "انسان کے دُکھ کا تو کوئی علاج

ہونا ہی چاہیئے۔"

اس کے بعد سمپورنا نند کی ہنسی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی اور وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس سے کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔ اس نے سب سے بات چیت بھی بند کر دی۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔

وسندھرا سراسیمہ ہوگئی۔ گوری حیران و پریشان تھی۔ مدھوسدن بوکھلا گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے سمپورنانند کے محل میں گیا تاکہ اُسے کسی طرح بہلا کر اُس کی دُنیا سے اپنی دنیا میں لے آئے۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ تم اتنے کھوئے کھوئے کیوں ہو؟"

"پتاشری! اب تک میں کھویا ہوا تھا۔ اب نہیں ہوں۔ آپ نے میرے لئے ایک خیالی دُنیا اور خیالی جنّت بسا رکھی تھی، میں اب اس سے باہر نکل آیا ہوں۔ کتنا کھوکھلا عیش و آرام آپ نے میرے لئے مہیّا کر رکھا تھا اور اسی کو میں اصلی زندگی سمجھے بیٹھا تھا۔ وہ دُکھ، وہ تڑپ، وہ تکلیف، وہ رنج، وہ اذیت جو ہر انسان کا مقدّر ہے۔ اس سے مجھے آپ نے محفوظ رکھنے کی ایک بچکانہ کوشش کی تھی۔ آپ میرے لئے بھگوان کا روپ دھارنے لگے تھے اور میں بھی آپ کو بھگوان سمجھنے لگا تھا۔ ہم دونوں اپنے آپ کو کتنا دھوکہ دے رہے تھے۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ آپ بھگوان تو کیا انسان بھی نہیں ہیں۔ اور میں انسان نہیں کانچ کی ایک مورتی تھا جس کے لئے آپ نے اِس ڈر میں زندگی گزار دی کہ کسی روز یہ ٹوٹ کر بے قیمت ہو جائے۔ اب میں آپ کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں یہ محل، یہ ماحول، یہ عیش، یہ آسائش، یہ تخت، یہ تاج سب کچھ تیاگ کر ایک عام انسان بننے کی تپسّیا کروں گا۔ میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا آشیرواد دیجئے۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تم یہاں نظر بند رہو گے۔" مدھوسدن گرج کر بولا۔

مدھوسدن نے سمپورنانند کے محل پر سخت پہرہ لگا دیا۔ سمپورنانند کئی روز تک نظر بند رہا۔ اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ہر وقت فکر میں کھویا رہتا۔ وسندھرا یہ محسوس کرتی کہ پتی کے ہوتے ہوئے بھی وہ ودھوا ہے اور اس کا بیٹا انا تھ۔ مدھوسدن اور

گوری کشمکش میں مبتلا تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ اگر سمپورنانند کو وہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیں، تو وہ سب کچھ تیاگ کر چلا جائے گا۔ اور اُس پر جبر کرتے ہیں تو اس کے وجود اور عدم میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

ایک روز سمپورنانند نے بالکونی سے دیکھا کہ پُرانا فرنیچر اور اسباب ایک ٹرک میں لاد کر کہیں بھیجا جا رہا ہے جس کی جگہ نیا آئے گا۔ وہ چپکے سے باتھ روم میں گیا اور میلے کپڑوں کے ڈبّے سے ایک میلی کچیلی دھوتی نکال کر بدل لی۔ قیمتی مالائیں اور انگوٹھیاں نکال کر ڈبّے میں ڈال دیں اور سب کی نظریں بچا کر ایک معمولی آدمی کی طرح باہر نکل گیا اور مزدوروں میں شامل ہو کر سامان ٹرک میں لدوانے لگا اور انہی مزدوروں کے ساتھ سامان پر چڑھ کر ٹرک سے چلا گیا۔ نیلام گھر کے باہر ٹرک رُکی۔ مزدور اُترے۔ سمپورنانند بھی اترا اور کام کرتے کرتے موقع پا کر نکل بھاگا۔ جنگل جنگل گھومتا پھرتا ڈرتا بھاگتا بھوکا پیاسا وہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

جہاں کہیں کوئی دھرم شالہ ملتا وہاں پڑ رہتا اور کھا پی لیتا۔ کسی سے دوستی نہ کرتا۔ اکیلا ہی رہتا۔ اور جانے کیا سوچتا رہتا۔ دھرم شالے میں یا کسی پبلک لائبریری میں اُسے اخبار ملتا تو وہ دھیان سے پڑھتا۔ اخبار میں کبھی اُسے اچھی خبریں پڑھنے ہی کو نہیں ملتیں۔ جنگیں، جرائم، فریب، قتل، خودکشی، حادثے، اغوا، زنا بالجبر، خیانتِ مجرمانہ، ہڑتالیں، دہشت گردی، دیوالیہ پن، سیاست دانوں کے جھوٹے دعوے، جہیز کے لئے لڑکیوں کا نذرِ آتش کیا جانا، فرقہ وارانہ اور طبقاتی منافرت، فقیروں اور سادھوؤں کا چھل، روحانیت کے دعوے داروں کے ہتھکنڈے، ذخیرہ اندوزی اور کالے بازار کے دھندے، منشیات کی تجارت، اسمگلنگ، ڈاکے، اور وہ سارے ہنگامے جن سے وہ اب تک ناواقف تھا۔ دو تین سال تک یہ سب کچھ وہ پڑھتا رہا، اور گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتے ہوئے کئی باتوں کا مشاہدہ بھی کرتا رہا اور اس سے دُکھ اٹھاتا رہا۔ اُسے اپنا اور اپنی حالت کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ اُسے دُنیا کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ انسان کی انسان سے دشمنی، انسان کی اپنے آپ سے دشمنی، انسان کی غیر انسانی حرکتیں، اُسے بے سبب نظر نہیں آ رہی تھیں، لیکن سبب بھی سمجھنے سے

وہ مجبور تھا۔ اور اسی پر وہ گھنٹوں سوچتا رہتا تھا۔

ٹیوشنیں کر کے وہ گزارہ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے آسمانی صحیفوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ اچاریہ رجنیش کی تقریروں کے بے شمار کیسٹ سُنے، مہیش یوگی کے آشرم میں ٹرانسینڈینل میڈیٹیشن کیا۔ تھیوسوفی اور یوجی کرشنا مورتی کی کتابیں پڑھیں۔ سوامی ویوک آنند کا پورا سٹ پڑھ ڈالا۔ اُن روحانیت پرست دانشوروں سے بھی ملاقات کی اور تبادلۂ خیال کیا، جو حق کی تلاش میں امریکہ اور سوئٹزرلینڈ ہو آئے تھے، لیکن انسان کے دُکھوں کا حل اُسے کہیں نہیں ملا۔ اس میں کئی برس اور گزر گئے۔

سمپورنانند کی بے اطمینانی، اُس کا اضطراب، اُس کی ذہنی ہلچل، اُس کی عمر کے ساتھ بڑھ گئی۔

آخر کار اُس نے طے کر لیا کہ جب تک انسان کے دُکھ درد کا علاج نہ پالے گا وہ مراقبہ کرتا رہے گا۔ اس مقصد کے لئے ایک قصبے کے قریب ایک درخت کے نیچے وہ پدما آسن لگا کر بیٹھ گیا۔

دن اور رات کا سفر، وقت کی رفتار، موسموں کے تسلسل، گرمی، سردی اور بارش کے اثرات اور فطری عناصر کے آہنگ سے بے نیاز وہ آنکھیں بند کئے اس ایک حالت میں مراقبہ کئے بیٹھا رہا۔

اور ایک بار جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اُسے محسوس ہوا کہ اس کی نگاہوں سے ایک کرن طلوع ہوتے ہوئے سورج سے جا کر ٹکرائی۔ اس کی دانش میں کئی کہکشائیں اُبھرنے لگیں اور وہ تمام سُورج منور ہو گئے جن کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں کئی کروڑ سال درکار ہوں گے۔ اس کے لبوں پر ایک پُراسرار نورانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"مجھے گیان مِل گیا پربھو۔ مجھے گیان مِل گیا۔ میں مانتا ہوں کہ تیرا وجود ہے اور یہ سارے تیرے ہی کرشمے ہیں۔ تو نے انسان کو پیدا کیا، اُسے عقل دی، جذبات دیئے اور

اب تماشہ دیکھ رہا ہے۔ عقل سے وہ کام نہیں لیتا اور جذبات اُسے گمراہ کر رہے ہیں۔ پھر بھی انسان کو سُدھارنے کے لئے تو نے کتنے پیغمبر بھیجے، کتنے صحیفے نازل کئے، لیکن افسوس کہ انسان نے اُن سے کچھ نہیں سیکھا۔ نہ وہ سُدھرا ہے اور نہ کبھی وہ سدھرے گا۔ مجھے گیان مل گیا کہ وہ کبھی سُدھر نہیں سکتا۔ اگر آواگون کا کوئی سلسلہ ہے، تو تجھ سے میری بنتی ہے کہ اب کبھی تو مجھے پیدا مت کر۔"

سمپورنانند نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سمادھی لے لی۔ اُس کی مسکراہٹ میں اب ایک چمک آ گئی تھی۔ اُس کے گرد ایک ہالہ تشکیل پانے لگا۔

●●

ہوائی قلعہ

چوبے پھولوں کے دو تین بڑے بڑے ہار ایک ہاتھ پر اٹھائے اور ایک پلاسٹک کی بڑی سی تھیلی دوسرے ہاتھ سے پکڑے کھولی میں داخل ہوا۔ بہو نے اُٹھ کر چرن چھوئے اور پلاسٹک کی تھیلی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"اس میں مٹھائی ہے، بچوں میں بانٹ دینا، تم بھی کھانا، کشن کو بھی دینا جو بچ جائے اُٹھا کر رکھ دینا۔" یہ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بچے دوڑ کر اس سے لپٹ گئے۔ اُس نے ہار ان کے گلے میں ڈال دیئے۔"

"چائے لاؤں؟" بہو نے پوچھا۔

"لے آؤ۔"

بہو چائے بنانے چلی گئی۔ چوبے چارپائی پر لیٹ گیا۔ بڑی دیر تک آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑا رہا۔ اپنے خیالوں میں اس قدر کھو گیا کہ اسے کشن کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ نوکری سے لوٹ کر کشن نے اپنے باپ کو چارپائی پر اُداس پڑے دیکھا تو آہستہ آہستہ اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اسے آواز دی۔

"بابو جی۔ بابو جی۔"

چوبے نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بہو دونوں کے لئے چائے اور مٹھائی لے آئی۔

"بابو جی۔ لگتا ہے ریٹائرڈ ہونے کا بڑا دُکھ ہو رہا ہے آپ کو۔ دُکھی ہونے کی کوئی بات

نہیں اب تو آرام کرنے کی عمر ہے آپ کی۔ میں اور آپ کی بہو تو سیوا کریں گے ہی آپ کی۔ بچوں سے جی بہلائیے۔ ٹھاٹھ کیجئے۔ مزے سے رہئے۔ اداس مت ہوئیے۔"

"بیٹا چالیس سال ایک ہی کمپنی میں کام کیا، ایک ہی مالک کی سیوا کی۔ اور وہ بھی کیسا مالک۔ واہ واہ واہ۔ بھگوان انھیں اور ان کی اولاد کو سکھی رکھے آج آفس ٹائم ہونے پر جب انھوں نے مجھے ہار پہنایا اور وداع کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چڈھا صاحب بولے۔ "چوبے، سمے بیتتا جاتا ہے۔ حالات بدلتے جاتے ہیں۔ زندگی ایک جیسی کبھی نہیں رہتی۔ تمھارے ریٹائر ہونے کا مجھے بڑا دکھ ہے۔ اور میں بھی کچھ ہی مہینوں میں ریٹائر ہو جاؤں گا اور سارا کاروبار لڑکوں کو سونپ دوں گا۔ انھیں تیار کر ہی دیا ہے۔"

"ٹھیک ہی تو ہے بابو جی۔ نئی پیڑھی کا ادھیکار بھی تو کوئی چیز ہے۔" کشن بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ میں بے کار کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھ سے بیکار نہیں رہا جائے گا۔"

"اوہو۔ بیکار چنتا کرتے ہیں آپ۔ بعد میں دیکھا جائے گا ابھی تو کچھ دن آرام کیجئے اور کچھ نہیں کہا چڈھا صاحب نے؟"

"بولے، کبھی کوئی تکلیف ہو، ضرورت ہو، تو شرمانا نہیں، میرے پاس آجانا تم اس کمپنی کا اٹوٹ حصہ ہو۔ جب فورٹ کی ایک ٹوٹی پھوٹی بلڈنگ کے ایک اندھیرے اور سیلے ہوئے کمرے میں ایک میز کرسی سے یہ کمپنی شروع ہوئی تھی۔ تم نئے نئے بمبئی آئے تھے نوکری ڈھونڈھنے اٹھارہ بیس سال کے چھوکرے تھے تم اور تم کو میں نے چپراسی رکھا تھا۔ اس وقت سے آج تک جب کہ نریمان پوائنٹ پر اتنا بڑا آفس ہے تم میرے خاص چپراسی رہے ہو۔ بہت بڑی بات ہے۔"

"اور کیا بولے۔"

"اور ... اور ... ارے ہاں۔" چوبے ایکدم چونکا۔ بڑے زور سے تالی بجا کر بولا۔ "لو سب سے اچنبھے کی بات تو بتانا ہی بھول گیا۔"

بہو نے کھولی کے ایک کونے میں بنی رسوئی میں بیٹھے بیٹھے۔ بڑی دل چسپی سے سسر کو

دیکھا کشن کو بڑی حیرت ہوئی۔ "وہ کیا بابو جی"

"ارے چڈھا صاحب نے پوچھا، چوبے، ہم تمھیں تمھاری محنت اور وفاداری کے صلے میں کوئی بڑا انعام دینا چاہتے ہیں۔ تمہی بتاؤ کیا دیں، اپنی پسند سے بتاؤ اور اپنے دل کا ارمان پورا کرو۔ ارے کشن۔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں تو گھبرا گیا۔ وہ بولے ڈرو نہیں۔ گھبراؤ نہیں، مانگ لو۔ بس میں نے کہا۔ حجور۔ میں کبھی ہوائی جہاج میں نہیں بیٹھا۔ ایک سفر کروا دیجئے۔ چڈھا صاحب پوچھے، کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا کشمیر۔ بولے ٹھیک ہے۔ جنرل منیجر صاحب سے بولے ہوائی جہاج سے چوبے کے کشمیر آنے جانے اور وہاں گھومنے، رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیں۔ جنرل منیجر صاحب نے تین چار روز کے بعد آنے کو کہا ہے وہ ٹکٹ بھی دے دیں گے اور سب سمجھا دیں گے"۔ چوبے ایک معصوم بچے کی طرح کھل اٹھا۔ "ہے نا مزے کی بات؟ کتنا بڑا دل ہے چڈھا صاحب کا۔ اب میں کشمیر جاؤں گا ہوائی جہاز سے"۔

بہو یہ سن کر بہت خوش ہو گئی۔ لیکن کشن کے چہرے سے کوئی خوشی ظاہر نہیں ہوئی۔

"ارے کشن۔ تو خوش نہیں ہوا یہ سن کر"۔

"نہیں بابو جی۔ یہ تو بڑے خوشی کی بات ہے۔ مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ چڈھا صاحب نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ اور گرتچویٹی آپ کو کتنی ملے گی، کب ملے گی"۔

"وہ میں نے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ سے معلوم کر لیا۔ کوئی چوبیس ہزار روپے گرتچویٹی کے ہوئے۔ تین چار روز میں چیک مل جائے گا۔ اور پینتیس ہزار کے لگ بھگ پراویڈنٹ فنڈ جو تین چار مہینے بعد ملے گا"۔

کشن سر جھکا کر اپنی پیشانی سہلانے لگا۔

"کیوں۔ کیا ہوا کشن"۔ چوبے نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہ ہے بابو جی۔ آپ تو جانتے ہیں یہ کھولی ہمارے پریوار کے لئے کتنی چھوٹی پڑ رہی ہے۔ آپ، میں اور بہو، تین۔ چھٹے کی تیاری ہے اور سالے صاحب بیکاری سے تنگ آکر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بمبئی آنے والے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ تو میں سوچ

رہا تھا کہ پڑوس کی کھولی پگڑی پر اٹھ رہی ہے۔ ہم ہی کیوں نہ لے لیں۔ سکھا رام ایک لاکھ مانگتا ہے۔"

"ایک لاکھ؟" چوبے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "ایک لاکھ ہم کہاں سے لائیں گے بیٹا۔ گریچویٹی اور پراویڈنٹ فنڈ ملا کر بھی تو ایک لاکھ سے بہت کم پڑتے ہیں۔"

"باقی کا... چڈھا صاحب دیدیں گے آپ کو نا نہیں بولیں گے۔"

"ہاں شاید دیدیں۔ لیکن میں نہیں مانگوں گا۔"

"کیوں؟"

"بیٹا۔ انعام اور بھیک میں بڑا فرق ہے۔ میں نے آج تک بھیک نہیں مانگی۔ نہ کبھی مانگوں گا۔" کشن چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔

سانتا کروز ایرپورٹ پر چوبے اپنا سامان کا ٹیگ اور سیٹ کا کارڈ لے کر پلٹا تو کشن کو ادھر اُدھر دیکھتا ہوا پایا جیسے وہ اپنے کسی دوست کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

"کسے دیکھ رہے ہو بیٹا۔"

"وہ... بابو جی... میرا ایک دوست یہاں لوڈر ہے۔ وہ..."

"اچھا۔ تو اسے ڈھونڈ رہے ہو۔"

"جی نہیں۔ اُس نے کہا تھا، یہاں ایک بیمہ کاونٹر ہے اور... یعنی کہ صرف دس روپے لگتے ہیں اور ایک لاکھ کا بیمہ ہو جاتا ہے۔"

"تمھارے خیال میں..."

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے کہا تھا، بہت سے مسافر بیمہ کروا لیتے ہیں۔ بابو جی کا بھی کروا لینا۔ ٹھیک رہے گا۔ صرف دس روپے ہی کی تو بات ہے۔ آئیے شاید وہ ہے بیمہ کاؤنٹر۔"

کلرک نے بیمہ کا فارم بھرتے ہوئے جب حادثے کی صورت میں ایک لاکھ روپے کے حقدار کا نام پوچھا تو چوبے نے کشن کو بڑے غور سے دیکھا۔ کشن جھینپ گیا۔

"بابو جی۔ بتائیے نا۔"

"کشن چوبے!" چوبے نے ایک باپ کی بھرپور شفقت سے کہا۔

گھر لوٹ کر کشن نے اپنی بیوی کو بیمے کی بات بتائی۔ بیوی کو پتہ ہی نہیں تھا بیمہ کیا ہوتا ہے۔ کشن نے اسے تفصیل سے سمجھایا۔

"بھگوان نہ کرے سسر جی کے ہوائی جہاج کو کچھ ہو جائے۔" بیوی اپنے ہی آپ دُعا کرنے لگی۔ "وہ صحیح سلامت پہنچیں اور صحیح سلامت لوٹیں۔"

کشن نے اسے گھور کر دیکھا۔

رات کو ٹرانسسٹر ریڈیو پر وِودھ بھارتی سے فلمی گانے بچے۔ بڑی دل چسپی سے سُن رہے تھے۔ لیکن کشن کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ بار بار میز پر رکھی ٹائم پیس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب پونے نو ہونے لگے تو اس نے اسٹیشن بدل کر بمبئی لگا دیا۔ خبریں سُنائی دینے لگیں۔

"تم تو ریڈیو پر سماچار کبھی بھی نہیں سُنتے۔" بیوی نے حیرت سے کہا۔

"آج ... بس ... ایسے ہی ..."

خبریں ختم ہوئیں۔ کشن نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

"ہوائی جہاز کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔"

بہو نے دیوار پر ایک چوکھٹے میں لگی ہنومان جی کی چھوٹی سی مورتی کی طرف پلٹ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور بڑے خلوص سے بولی۔ "بجرنگ بلی، دھنیہ ہو۔"

●●

نہ جانے کیوں

بمبئی کی وحشت ناک بارش کا موسم تھا۔ سارے شہر کی زندگی کئی روز سے معطّل تھی۔ مجھ جیسی کال گرل کا دھندا بھی کئی روز سے بند تھا۔ کیونکہ ٹیلی فون بند پڑے تھے۔ راستے بند تھے۔

جی بہلانے میں قریب ہی نیوٹاکیز میں ہالی وُڈ کی ایک مشہور فلم دیکھنے سہ پہر کو چلی گئی۔ یہ فلم کئی بار لگ چکی تھی۔ دیکھنے والے کم ہی لوگ تھے۔ میں شاید سب سے آخر میں تھی یا خیالات میں گم ہونے کی وجہ سے کچھ ایسا سمجھ رہی تھی کیونکہ ٹکٹ لے کر جب میں تیزی سے پلٹی تو کسی سے ٹکرا گئی۔

"اوہ۔ آئی ایم سوری" رسمی طور پر لیکن بے اختیار میں نے کہہ دیا۔

"سوری تو مجھے کہنا چاہیئے" اُس آدمی نے کہا "غلطی تو میری ہے۔ مجھے آپ سے اتنا قریب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ آئی ایم سوری"

میں نے ایک جھوٹی مسکراہٹ سے اُس کا جواب دیا اور تھیٹر میں چلی گئی۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ ویسا ہی باتونی ہے جیسے کہ عورتوں کو پٹانے والے عام طور پر ہوتے ہیں۔ ایسے باتونی مرد بہت دیکھے ہیں۔ لیکن ایسا مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک نظر اور ایک ہی جھلک میں اُس کی تصویر میری رُوح میں اُتر گئی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں آج تک لہرا رہی ہے۔ جی چاہا کہ تھیٹر جانے سے پہلے ایک باریوں ہی دیکھ لوں۔ مگر فوراً اپنے آپ پر میں نے قابو پالیا۔ اگر اس نے اپنی طرف مجھے پلٹ کر دیکھتا ہوا دیکھ لیا تو اکڑ جائے گا۔ اور سمجھے گا کہ وہ مجھے پٹانے میں کامیاب ہونے لگا ہے۔ میں اُسے دیکھے بغیر اندر چلی گئی۔

فلم شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ میں گیلری میں سجائی گئی موجودہ فلم اور آنے والی فلموں کی

تصویریں دیکھنے لگی۔ دل بہت چاہتا تھا کہ وہاں گھومتے لوگوں پر ایک اچٹتی نظر ڈال لوں اور اسے بھی دیکھ لوں، مگر پھر میرا 'مَیں پن' آڑے آگیا اور میں تھیٹر میں چلی گئی۔

ہال میں ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ سلائڈز دکھائے جا رہے تھے۔ یہ خواہش بڑی شدید ہو کر اُبھرنے لگی تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے اُسے پلٹ کر ایک نظر ضرور دیکھ لوں، لیکن نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اگلی قطار کی سیٹ پر آئے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے ٹکٹ لیتے وقت مجھ سے بالکل پیچھے اتنے قریب سے دیکھ لیا ہو کہ میری سیٹ اور قطار کا نمبر کیا ہے اور میرے برابر کی سیٹ ہی اُس نے لے لی ہو۔ اور پھر مجھے حیران اور پریشان کرنے کے لئے اندھیرا ہونے کے بعد آ کے چپکے سے میرے پاس بیٹھ جائے اور باتیں یا بدتمیزی شروع کر دے، تب میں اس سے نپٹ لوں گی، لیکن وہ میرے پاس بیٹھے تو سہی۔

میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ آخری گھنٹی بجی، اندھیرا ہوا، اشتہاری فلمیں دکھائی جانے لگیں۔ اتنی زیادہ اور اتنی پرانی کہ سر دُکھنے لگا۔ وہ ختم ہوئیں تو آنے والی فلموں کی جھلکیاں شروع ہو گئیں۔ میں اپنی قطار میں اکیلی بیٹھی تھی۔ بالکل اکیلی۔ میرے دائیں بائیں سبھی سیٹیں خالی تھیں۔ میرے بیحد انتظار اور خواہش کے باوجود وہ نہ آیا۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ نیوز ریل بھی دکھائی گئی۔ کوئی آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ انٹرول ہوا۔ دھیمی دھیمی روشنی دبے دبے قدموں اِدھر اُدھر پھیل گئی۔

شاید میں نے اس کا حوصلہ پست کر دیا۔ مَیں اگر باہر جاؤں تو وہ شاید کوئی بہانہ تراشے اور پھر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ یہ سوچ کر میں اٹھی اور باہر چلی گئی۔ پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر کسی کو نہیں دیکھا۔ گیلری میں آ کر ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے آنے والی کسی فلم کے شو کارڈ دُور ہی دُور سے دیکھنے لگی۔ یہ صرف اپنی لاپرواہی کا ایک دکھاوا تھا۔

"لیجئے۔ تھمس اَپ سے شوق فرمائیے۔" وہ تھمس اَپ کی دو بوتلیں لئے میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

آخر آ گیا ناسم پر۔ میں جانتی تھی کہ جائے گا کہاں۔ سبھی مرد دل پھینک ہوتے ہیں اور سبھی کی فطرت ایک ہوتی ہے۔ ایک بار جی میں آیا کہ ڈائیٹنگ کے بہانے انکار کر دوں۔

"تھینک یو۔" میں نے مسکرا کر ہاتھ سے بوتل لے لی۔

"مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں انکار نہ کر دیں۔"

"اور اگر میں انکار کر دیتی تو؟"

"جی ہاں، یہ تو بہت ممکن تھا۔ بہت سی عورتیں کبھی کبھی ڈائٹنگ کرتی رہتی ہیں۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں۔" یہ باتونی مرد تو اُلٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی جان بوجھ کر پھر نہیں پوچھا کہ میں انکار کر دیتی تو کیا ہوتا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ پھر کس انداز سے وہ بات شروع کرے گا۔

"ہاں اگر آپ انکار کر دیتیں تو سچ مچ بڑی مشکل ہو جاتی۔" کولڈ ڈرنک پیتے پیتے اچانک رُک کر اُس نے کہا۔ "کیونکہ ڈائٹنگ میں کولڈ ڈرنک، آئس کریم، ویفرز، پاپ کارن وغیرہ سبھی کا پرہیز ہوتا ہے۔"

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اور چپ چاپ کولڈ ڈرنک پیتی رہی۔ مجھے اس کی آواز اور انداز بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ باتوں میں تو بڑا کائیاں تھا۔ لیکن انداز بالکل بچّوں جیسا بھولا بھالا معصوم۔ پتہ نہیں اب تک کتنی عورتوں کو پٹایا ہوگا اس نے۔ مگر میں پھنسنے والی اسامی نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو آدمی بڑا دلچسپ ہے۔ نہ جانے کون ہے۔

"آپ بھی کیا سوچ رہی ہوں گی نہ جانے کون ہے، جو مجھ سے یوں بے دھڑک بول رہا ہے۔ آپ مجھے بڑا باتونی سمجھ رہی ہوں گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ بھی اکیلی ہیں اور میں بھی اکیلا تو میں نے سوچا کیوں نہ یہ فلم ہی دونوں ساتھ دیکھیں، زیادہ مزا آئے گا اور۔۔۔"

"لیکن۔۔۔" میں نے تکلّف کے طور پر اُس کی بات کاٹنے کی ناکام کوشش کی۔

"لیکن کیا۔ میرے آس پاس بھی سیٹ خالی ہے اور آپ کے آس پاس بھی۔"

"مجھے آپ کے ساتھ فلم دیکھنے میں تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کیجئے گا میں اس قسم کی عورت نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"ہمارے ملک میں یہ بڑی مشکل ہے کہ عورت اور مرد کا ساتھ یا دوستی ہمیشہ بُری نظر سے پرکھی جاتی ہے۔ خیر آئیے۔"

اُس نے میرے ہاتھ سے خالی بوتل لے لی۔

ہم دونوں جب ہال میں جانے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ سب کی نظریں ہم دونوں پر تھیں اور اُن نظروں میں شرارت آمیز خیالات چمک رہے تھے۔ مگر مجھے کسی کی کیا پروا۔ میرے لئے بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ میری خواہش پوُری ہوگئی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا۔

ایسی ویسی حرکت سے میں نے اُسے باز رہنے کو کہہ تو دیا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ تھوڑی دیر بعد دست درازی شروع کر دے گا۔ تھوڑی بہت تو میں سہہ بھی لوُں گی۔ اپنی خواہش پوُری کرنے کی کچھ تو قیمت دینی ہی پڑے گی مجھے۔ میں انتظار کرنے لگی۔ فلم سے زیادہ دلچسپی مجھے اُس میں ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ میری ران یا سینے پر اس کے ہونٹ میرے رخسار کی طرف بڑھنے ہی والے ہیں کسی بھی لمحے، اب ... بس اب ... اب کی بار ... اس دفعہ تو ... بس اب ... بوسے بازی کا کوئی منظر پردے پر ہوتا تو میں بھی امّید کرنے لگتی کہ .... مگر میرے انتظار اور امید کی خاموش فلم ہی چل رہی تھی۔ ریلیں ایک کے بعد ایک گزرنے لگیں۔ یہاں تک کہ فلم ختم ہوگئی۔ دو گھنٹہ وہ بڑے ادب اور تہذیب سے بیٹھا رہا۔ سیٹ کے دائیں دستے پر جہاں میں نے اپنا ہاتھ رکھا تھا، اُس نے اپنی کہنی بھی ٹکانے کی کوشش نہیں کی، جس سے ہمارے ہاتھ ٹکرا جاتے۔ اجنبی عورت کے بدن سے لمس حاصل کرنے کی یہ تو بڑی عام اور معمولی ترکیب ہے۔ نہ ہی اس نے کوئی بات کی۔ لگتا ہے کہ میری تاکید سے اُسے ہمّت نہیں ہوئی، ورنہ وہ ضرور کوشش کرتا۔ اتنا کائیاں ایسے چپ چاپ کیسے رہ سکتا تھا۔ مایوسی کی شدّت اور تڑپ سے اب تو میرا پوُرا بدن اُس کا انتظار کرنے لگا۔

ہم دونوں چپ چاپ باہر نکل آئے۔

"میرا فلیٹ یہاں سے قریب ہی ہے۔ چل کے چائے پی لیجئے"، وہ بولا۔

"مگر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی"۔

"بس چائے پیتے ہی چلی جائیے"۔

اس نے ٹیکسی کر لی۔ سینٹ اینڈریوز چرچ کے پیچھے سینٹ پال روڈ کی ایک شاندار بلڈنگ پر ہم پہنچے۔ اس کے فلیٹ کے دروازے پر اس کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ آصف زیدی۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ سی۔

"آپ نے میرا نام تو پڑھ لیا۔ اپنا نام بتائیے۔"

"مینا۔"

"معاف کیجئے، یہ تو بڑا عام سا نام ہے۔ ایسی لاکھوں میں ایک عورت کا نام لاکھوں میں ایک ہونا چاہیئے۔"

میں کیا جواب دیتی۔ مُسکرا کر چُپ رہی۔

"یہ ہے میرا فلیٹ۔ ایک بیڈ روم اور ایک ہال، اکیلے اور کنوارے آدمی کے لئے کافی ہے۔ ایک منٹ ٹھہریئے، میں چائے چولہے پر چڑھا دُوں۔"

وہ تو کچن میں چلا گیا۔ میں گھبرا سی گئی۔ میرا بدن جو اس کے بدن کے لئے ترس رہا تھا، بکھر رہا تھا اب سمٹنے لگا۔ مجھے ایسے مرد بالکل پسند نہیں جو پہلی ہی ملاقات میں عورت کو پٹا کر زور اور فخر کرنے لگتے ہیں۔ اور ایک بار ان کا مطلب پُورا ہو جائے تو ایسی عورت سے ان کا سلوک بعد میں ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے طے کر لیا کہ میں اپنے آپ کو اس کے حوالے نہیں کروں گی۔

"دیکھئے کیسی فرسٹ کلاس چائے پلاتا ہوں آپ کو۔ ویسے میں کھانا بھی بہت اچھا پکاتا ہوں۔ کسی دن فرصت سے کھانے کو بھی آئیے نا۔"

"ضرور آؤں گی۔" میں نے ٹالنے کو کہہ دیا۔ ویسے مجھے دیکھنا تو یہ تھا کہ اُس کا رویّہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔

"آپ مُنہ ہاتھ دھونا چاہیں تو۔۔۔"

"جی نہیں۔ گھر جا کر ہی۔۔۔"

"کہاں ہے آپ کا دولت خانہ۔"

مَیں نے جھوٹ مُوٹ باندرے کی ایک مشہور سڑک کا نام اُسے بتا دیا۔

"آئیے میں آپ کو اپنا فلیٹ دکھاؤں۔"

مَیں سمجھ گئی کہ یہ مجھے بیڈ روم لے جانے کی تیّاری ہے۔ اُس نے کچن دکھایا جو بند ڈبّوں کی دواؤں اور مسالوں کے ڈبّوں سے بھرا تھا۔ نئے ڈیزائن کے چُولہے، مائیکرو ویو تندور، جدید

ضروریات کی چیزیں اور قیمتی کراکری نہایت ہی صاف ستھری حالت میں سجی رکھی تھی۔ باتھ روم چھوٹا سا، جس میں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ شیمراک کا نیلا قیمتی کموڈ اور شاور باتھ کا پائپ جسے ہاتھ میں پکڑ کر بدن کے جس حصّے پہ چاہو پانی برسا لو۔ ایک طرف گیزر لگا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اسٹریو فونک ساؤنڈ سسٹم والا ریڈیو گرام درمیانی دیوار سے لگا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جرمنی کا بنا ہوا فلپس کلر ٹیلی ویژن بھی۔ قالین کشمیری تھا اور ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں چپن ڈیل کی۔ دیوار پر ایک موڈرن پینٹنگ آویزاں تھی۔ اس کے مقابل دیوار میں کتابوں کی شیلف تھی۔ بیڈ روم ایر کنڈیشنڈ اور فلیٹ کا سب سے نفیس حصّہ تھا۔ مکڑی کا وہ خوبصورت جال، جس سے شاید ہی کوئی خوبصورت شکار بچ سکے۔ یہاں میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اپنے بچاؤ کے لئے پوری طرح تیار ہوگئی مگر نہیں۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے مزے دار چائے پی رہے تھے اور وہ باتونی، بڑی بے تکلفی سے بول رہا تھا۔

"مینا! میں نیا نیا بمبئی آیا ہوں۔ یہ فلیٹ مجھے کمپنی کی طرف سے ملا ہے۔ میں یہاں ایک مشہور غیر ملکی فرم کا نمائندہ ہوں۔ تنخواہ اور بھتہ وغیرہ ملا کر ہر مہینے لگ بھگ تین ہزار مل جاتے ہیں۔ یہاں میرا کوئی نہیں۔ میری کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں۔ نہ کوئی ایسی ویسی لڑکی میری گرل فرینڈ بن سکتی ہے۔ مجھے تم جیسی ایک لڑکی کی تلاش تھی۔"

"آپ نے مجھے غلط سمجھا۔" میں اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھی۔

"میں نے تمھیں ابھی سمجھا ہی کہاں ہے۔ یہ تو صرف پہلی ملاقات ہے۔ ابھی تو ہم کئی دفعہ ملیں گے پھر ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ یہاں آؤ۔ مجھ سے ملتی رہو۔ یہاں بہترین شرابوں اور کھانوں سے تمھاری تواضع کروں گا۔ جب بھی تمھارا موڈ خراب ہو تم خوب رونا چاہو، اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہو یا اپنا موڈ اچھا کرنا چاہو۔ میں تمھیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مطلب یہ کہ تم مجھے اپنا بہترین دوست سمجھو، جو میں ہمیشہ بننے کی کوشش کروں گا۔"

"اس کے بدلے میں آپ مجھ سے کیا لیں گے؟" میں نے اُسے کھلم کھلا میدان میں آنے کے

لئے للکارا۔

"صرف تھوڑی دیر کی رفاقت۔ ایسے ویسے تعلقات بالکل نہیں، جن کا تمھیں خوف ہے۔ کم سے کم جب تک ہم دونوں جذباتی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد بھی تمھاری رضامندی سے۔ ویسے میں اپنی ضرورت کبھی نہ کبھی پوری کر ہی لیا کرتا ہوں۔ تم سے تو میں بات کر رہا ہوں اپنی زندگی کے جذباتی خلاء کو پُر کرنے کی۔ امید ہے کہ ..."

"افوہ!" میں نے فوراً اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ "سات بج گئے۔ مجھے چلنا چاہیئے۔"

میں اس ملتے رہنے کا جھوٹا وعدہ کر کے چلی آئی۔

مدّت ہو گئی ——— اس سے میں آج تک نہیں ملی۔

●●

ہماری مطبوعات

پھول جیسے لوگ	(ناول)	انور خاں
یادبسیرے	(افسانے)	انور خان
لمحوں کی قید	(افسانے)	کشور سلطانہ
افسانہ ۸۹ء	(افسانے)	انیس امروہوی
موجِ سحر	(شاعری)	ڈاکٹر انجنا سندھیر
قند و زقند	(طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی
برزخ	(افسانے)	ھاجرہ شکور
قُرأت	(ناول)	حسین الحق
نیلام گھر	(ناول)	مشرف عالم ذوقی
کیا مذاق ہے	(مزاحیہ شاعری)	اسمٰعیل آذر
بھوکا ایتھوپیا	(افسانے)	مشرف عالم ذوقی
گھٹتے بڑھتے سائے	(افسانے)	علی امام نقوی
کانچ کی چادر	(شاعری)	مریم غزالہ
رنگین پرواز	(شاعری)	پی - این - رنگین
اردو تنقید حالی سے کلیم تک	(تنقید)	سید محمد نواب کریم
دل کی بات	(افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی
کاغذ کی دیوار	(افسانے)	محافظ حیدر
وہ بھی اِک زمانہ تھا	(فلمی شخصیات)	انیس امروہوی
عظمتِ غالب	(غالبیات)	سید قدرت نقوی
اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ	(تنقید)	محبوب علی قریشی

تخلیق کار پبلشرز
۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے
دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰